و غبار



غبارِ شب

قاضی عبدالستار

کتابت: علی احمد
مطبع : نامی پریس
بار اوّل : ۶ سو
نومبر: ۱۹۷۴ء
قیمت : ۸ روپے

غبارِ شب

اور دو دوسرے ناولٹ

قاضی عبدالستّار

نصرت پبلشرز - وکٹوریہ اسٹریٹ
کیپٹو دما رکیٹ لکھنؤ ۳

نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ ۳

فہرست

قیمت:-
آٹھ روپے

مجّو بھیّا

مجّو بھیّا

پنڈت آنند سہائے تعلقدار لگراواں کے مرتے ہی شیخ سرور علی نے مختاری کے چونچلوں کو سلام کیا اور کمر کھول دی۔ نئے رئیس پنڈت درگا سہائے نے جھوٹ موٹ کی للّو چپّو بھی کی لیکن شیخ جی (وہ لگراواں میں اسی نام سے بجتے تھے) اپنے ٹانگن پر سوار ہو کر مان پور آ ہی گئے۔ شروع شروع میں شیخ کو مان پور میں ایسا لگا جیسے صبح سورج کی مشعل لئے شام کو ڈھونڈھا کرتی ہے اور شام اپنی آرتی میں ستارے جلائے صبح کی راہ تکا کرتی ہے۔ مگر جنت کے آتے آتے انھوں نے کاشت کاروں سے اپنی سیر نکال لی اور چار جوڑ بیل خرید کر کھیتی شروع کر دی۔ پہلا پانی پڑتے ہی بستی سے ملے ہوئے پچاس بیگھے کے پلاٹ پر کنواں کھود کر قلمی باغ کی طرح بھی ڈال دی تھی لیکن وقت اب بھی کاٹے نہ کٹتا۔ آخر کار انھوں نے اپنی شیخی کو طاق پر رکھا اور بستی

کے بڑے بوڑھوں میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ کسی کو تعویذ لکھ دیتے، کسی کو سرمے منجن کا نسخہ بتاتے، کسی کے پھوڑے پھنسی میں اپنے ہاتھ سے پولٹس باندھتے، کسی کا خط لکھتے، کسی کا مقدمہ لڑاتے، غرض پانچ چھ ہزار کی بستی اور وہ بھی مسلمان بستی میں ان کا وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ "شبرات" کا چاند دیکھ کر وہ اپنی بیٹھک میں تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ چھوٹے خاں اور جلاہوں کے چودھری منیر بخش دو چار بڑے بوڑھوں کے ساتھ آگئے۔ شیخ نے ان کو پلنگوں پر بٹھایا اور منظور کو آواز دی۔ وہ سیاہ لنگوٹ باندھے موٹے ہاتھ پیروں پر تازی تازی مٹی ملے دندناتا ہوا آیا اور بھونچکوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ شیخ نے بیٹے کا یہ حلیہ جو دیکھا تو حقے کی چلم کی طرح جل گئے۔ کڑک کر پوچھا۔

"یہ کیا"۔ منظور نے منمنا کر جواب دیا کہ "مدّی چچا سے کشتی لڑ رہا تھا۔ مدّی جو بڑے بڑے پہلوانوں سے لنگوٹ چھین چکا ہے؟" شیخ معلوم نہیں کیا کیا سوچ ڈالتے کہ چھوٹے خاں نے چونکا دیا۔

"شیخ جی..... بستی کی ساری برادریوں کے چودھریوں نے ایک بات طے کی ہے"۔

"میں بغیر سنے مانے لیتا ہوں"۔ شیخ بولے۔

"ماننے کی بات نہیں شیخ جی کرنے کی ہے"۔

"معلوم بھی تو ہو"۔

"بات یہ ہے کہ ہماری مسجد ہے بہت چھوٹی اور بستی کے نمازی تو آپ جانتے ہی

ہیں پانچ چھ ہزار کی بستی کے نمازی ہیں۔۔۔۔ سمائیں تو کہاں سے سمائیں۔۔۔۔۔
جہاں تک پیسے کا معاملہ ہے تو اگر روپیہ گھر بھی لے لیا تو بوری بھر ہو جائے گا۔۔۔۔
ہاں زمین کی بات ٹیڑھی ہے۔ آپ نے بتیس برس پنڈتوں کی خدمت کی ہے ان سے کہیے کہ مسجد کے سامنے والی ٹکڑی دے دیں۔ رہی نذر نذرانے کی بات تو دس بیس بار ڈھ لے لیں۔"

چھوٹے خاں نے تو ایک سانس میں سب اگل دیا، لیکن شیخ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ منظور چلم بھر کر لایا۔ حقے پر رکھ دی۔ ٹھنڈا دیا کر ٹہنال باپ کے لبوں تک پہنچائی تھوڑی دیر تک نگاہ کے اٹھنے کا انتظار کیا پھر شیخ کو مراقبے میں سوتا پاکر دبے پاؤں چلا گیا۔ قصائیوں کے چودھری قاسم نے سینے پر پھیلی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا کھنکار کر تھوکا پھر بہت چبلا چبلا کر گویا ہوئے۔

"اس شِستم کی بھی کوئی انتہا ہو کہ ہندوؤں کی دس بجھریاں ہیں اور تین سوالے ہیں ہماری بجارڈیڑھ ہجار بجھریاں ہیں اور ایک مسجد وہ بھی۔۔۔۔ ڈیڑھ ہاتھ کی۔"
انھوں نے اپنے لمبے چوڑے بالشت سے پلنگ کی پٹی ناپ کر بتائی۔ اب منیر بخش کے لئے بولنا سُنّت تھا کیونکہ وہ سُنّت کے بڑے رسیا تھے۔

"مان پور سے لگراداں والوں کو بھی لگان کے لئے تکا جا ہنیں کرنا پڑا۔ نجر نجرانہ تک ہم پنچ گھر بیٹھے دے آئے تھے۔ نری چار پیسے کی پٹی چاہے دیر سے پہنچے چاہے سویرے سے لیکن ان کے پندرہ آنے کی کوڑی کوڑی چکائے کے رد تی چھوئی ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے گردن اٹھائی بے نور آنکھوں سے سب کے چہروں پر
لکھی ہوئی ایک سی عبارت پڑھی اور مری مری آواز میں بولے۔
"کل صبح گنگراوال جاؤں گا۔"

صبح کو جب شیخ قرآن مجید کی تلاوت کر کے اٹھے تو منظور کی چارپائی خالی تھی۔
ورنہ وہ الٹی سیدھی ٹکریں مار کر بڑی دیر تک پڑا اینڈتا رہتا تھا۔ رجب کی ماں سے
پوچھا۔ اس نے تازی روٹی میں گودگود کر گھی بھرتے ہوئے جواب دیا کہ بھیا بڑی دیر
سے باہر گئے ہیں۔ شیخ باہر آئے تو ٹانگن غائب تھا۔ کوٹھری کھولی تو ساز رکھا تھا
ہاں لگام غائب تھی۔ شیخ دھک سے رہ گئے۔ صحن میں ٹہلتے رہے اور سورہ یٰسین پڑھتے
رہے۔ شیخ ٹانگن کی شرارت جانتے تھے۔ ادھر سوار کی پٹری بگڑی ادھر اس نے
پھینکا۔ شیخ جن کی سواری کی جوار میں دھوم تھی ان تک کو یہ ٹانگن ٹینچیاں کھلا چکا
تھا۔ اس کی اسی ادا پر تو شیخ ریجھے ہوئے تھے۔ ورنہ انھوں نے کبھی ایک جانور
پر دو برس سواری نہیں کی۔ وہ سوچتے سوچتے باہر نکل آئے۔ آج انھوں نے اپنے
آپ کو آمادہ کر لیا تھا کہ منظور کی پٹائی کر ڈالیں۔ ماں کی موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
لونڈے کو دلار میں چوپٹ کر لیا جائے۔ وہ اپنے غصے کو ابھار ہی رہے تھے کہ ٹاپوں کی
آواز آئی۔ منظور ماہر شہسوار کی طرح گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر تصویر بنا بیٹھا تھا۔ ٹانگن
دھول کی طرح ان کے پاس سے گزر گیا۔ وہ کوٹھری میں پہنچے۔ ٹانگن پسینے میں شرابور

بھینسے کی طرح کھڑا ہانپ رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختے اندر پہنچے۔ منظور رجب کی ماں کے کوٹھے سے کولھا جوڑے گھی میں ڈوبی روٹیاں کھا رہا تھا۔ انھوں نے اسے چیخ کر پکارا اور صحن میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے کرتے کے دامن سے اپنا منھ پونچھا اور آکر بے نیازی سے بیٹھ گیا۔

"اٹھائیسواں پارہ سناؤ۔"

شیخ کی دہاڑ سن کر منظور نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بس۔" پھر ریکارڈ بجنے لگا۔ شیخ نے زیر زبر کی غلطی کا بہانہ ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی لیکن کچھ بس نہ چلا۔ پارہ ختم کر کے منظور اٹھا اور دودھار سے دو کٹورے دودھ نکال کر پانی کی طرح چڑھا گیا۔ شیخ اس کے بدن کی حیرت انگیز اٹھان دیکھتے رہے اور اپنا غصہ بلاتے رہے، مگر وہ کسی طرح آہی نہ چکتا تھا۔ مجبوراً باہر چلے گئے۔ اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی اور لُو چلنے لگی تھی۔ کھلیان میں تھوڑا گیہوں پڑا تھا۔ شیخ اٹھوانے چلے گئے۔ گیہوں تو پڑا رہا البتہ شیخ اٹھوا کر لائے گئے۔ لُو کے ایک ہی تھپیڑے میں جل کر سیاہ ہو گئے تھے۔

شیخ کے جنازے پر سارا مان پور رویا تھا۔ منظور تو اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ منظور کو اس خوشی کا بھی انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ساری رات مدّی چچا سے کشتی لڑ سکتا ہے اور سارا دن ٹانگن پر سواری کر سکتا ہے۔ مڈل اسکول کا بھاری

بستہ جو منظور کی بیل کی سی گردن پر گاڑی کے جوئے کی طرح رکھا تھا پرانے سامان کی کوٹھری میں دفن ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کی ہمیل ٹانگن کی گردن میں گنگنانے لگی۔ لگام میں ریشم کی ڈوریاں چمک اٹھیں۔ اکھاڑے کو وسیع کر کے اس کی مٹی کو ملائم کیا گیا اور ندی چچا سے منظور کے دو دو گھنٹے داؤں ہونے لگے۔ ٹانگن پر دس دس میل کے چکر لگنے لگے۔ مان پور کے اتر اور پچھم میں دور دور تک پاسیوں کے گاؤں تھے جو سب آپس میں عزیز دار ہونے کے باوجود لڑتے رہتے تھے۔ ان لڑائیوں کا سبب شکایت سے زیادہ قوت کا اظہار تھا۔ تاہم یہ وقت پڑنے پر غیر پاسی کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے۔ ان میں سب سے مضبوط سب سے اہم اور سب سے وسیع گھرانا جیورہ کے راج دین کا تھا۔ جس کے درجنوں بھائی دس بیٹے اور اتنی ہی بیٹیاں تھیں۔ ان سب کی شادی بیاہوں نے دور دور تک اس کا اثر پھیلا دیا تھا۔ راج دین ککراوا کا نوکر تھا۔ لیکن جب شیخ گھر بیٹھے تو راج دین شیخ کی جائیداد کا منتظم ہو گیا۔ راج دین کا چھوٹا لڑکا رام دین منظور کا ہمجولی تھا اور منظور کو "منجور" بھیا کے بجائے مجو بھیا کہتا تھا۔ منجور بھیا کا یہ مخفف رام دین نے اپنی آسانی کے لئے کیا تھا جو دھیرے دھیرے مان پور کی زبان پر چڑھ گیا۔ شیخ کے مرنے کے بعد راج دین نے جائداد کے چھوٹے موٹے کام رام دین کے سپرد کر دیے۔ اس کا بہت بڑا سبب منظور کی وہ دل کشی تھی جس نے رام دین کے علاوہ جوار کے بہت سے مطمئن گھرانوں کے نوخیز لڑکوں کو فتح کر کے اپنی رکاب میں شامل کر لیا تھا۔ مان پور، سیتا پور، اور ہردوئی کی سرحد پر تھا اور

تین تھانوں میں تقسیم تھا۔ اس نزاکت سے فائدہ اٹھا کر جرم کے جائے وقوع میں ذرا سی تبدیلی کر کے ہر تھانے دار اپنا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پولیس والوں کی زبان میں مان پور بنجر بھی تھا۔ روایت تھی کہ فلاں کے باپ نے ڈھکے کے دادا سے دو روپے قرض لے کر پولیس کو کسی زمانے میں رشوت دی تھی۔

مان پور کی مفلسی کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی جس کی بنا پر پولیس یہاں کے واقعات میں دلچسپی بہت کم لیتی تھی۔ مان پور کے دو تھانے لکھراواں کے تعلقے میں تھے اور لکھراواں کے مختارِ عام شیخ منصور علی کا وطن مان پور تھا۔ شیخ کی مراعات نے پولیس کو اخلاقی طور پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مان پور کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ ان حالات نے مان پور کی نفسیات بگاڑ دی تھی۔ جس لڑکے کے ہاتھ پیر سلوتر ہوتے وہ کسی نہ کسی استاد کا شاگرد ہو کر بدن بناتا۔ کسی نہ کسی اکھاڑے میں شامل ہو کر بانا گھماتا۔ گلے میں کالا تاگا اور ڈنڈ پر لال تعویذ باندھ کر سات ہاتھ کی لمبی لاٹھی بغل میں دابتا اور بے پئے جھوم جھوم کر مٹر گشتیاں کرتا۔ جب تک باپ چچا روٹی دے پاتے، دیتے۔ پھر وہ دو دو تین تین ضلعوں سے بھاگے ہوئے بدمعاشوں سے یارانہ بڑھاتا، کبھی ضرورتاً اور کبھی تفریحاً ڈکیتی تک میں شامل ہو جاتا۔ جب معاملہ شیخ کے ہاتھ سے نکل جاتا تو صافے میں کمر بندھوا کر جیل چلا جاتا۔ چھوٹ کر آتا تو "سسرال" کے قصے سناتا اور دل کو دہلا دینے والے قہقہے لگاتا۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے شیخ کے بال سفید ہوئے تھے۔ اسی لئے جس دن منظور نے استاد منّے کے اکھاڑے میں لکڑی سیکھنے کی اجازت مانگی اس دن

شیخ نے پہلی بار دلار سے منظور کو ڈانٹا۔ قرآن مجید کا سبق لمبا کر دیا۔ آموختہ دوبارہ سنا۔ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی لال بخش کو سختی کرنے کی تاکید کی۔ اس فضا میں منظور کا بدن لگڑی کی بیل کی طرح پھیلتا گیا۔ اس کی چھٹیا چونٹیوں کے دل کی طرح بڑھتی گئی۔ منظور کے بجائے مجّو بھیا کے نام سے وہ مشہور ہوتا گیا۔ اور موروثی باغ اور کھیتوں کی آپ ہی آپ نگرانی ہوتی رہی۔

ہنیوت کا زمانہ تھا۔ گیہوں بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہوئے مجّو بھیا بیلوں کو بجھڑے کے آٹے کی لوئیاں کھلوا رہے تھے۔ اور چکّی پر گاتی ہوئی پنہاریوں کے گیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہروا ہے نے ٹانگن کی بیماری کی خبر دی۔ مجّو بھیا کی چھٹیا۔ یہ خبر سنتے ہی دوڑ پڑی۔ چار چار کوس کے دھاٹے مارے۔ جوار بھر کے سیانوں کی بھیڑ لگا دی۔ مگر ٹانگن مرگیا۔ یاروں نے تالاب کے کنارے گڈھا کھود کر اس کی لاش دبا دی۔ چھوٹے خاں کے بیٹے فجّو خان نے ہانک لگائی۔

"فکر نہ کرو مجّو بھیا اگلے سال اللہ نے چاہا تو اس کا عرس کریں گے۔"

مگر فجّو خاں کی اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ مجّو بھیا کو سوگوار دیکھ کر کھڑیوں کے چودھری کا بیٹا بخش اپنا لنگوٹ باندھتا ہوا آیا اور مجّو بھیا کے چوڑے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم گھوڑا پسند کر لو مجّو بھیا۔"

"ہاں اور تم گھر کے آنگن سے مٹھور کھود کر روپیہ گن دینا۔۔۔ کیوں نا؟"

"اور جو مٹھور ہی کھود دیں مجّو بھیا تو۔"

یہ کہہ کر اس نے ان کو اکھاڑے کی منڈیر پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"مسجد کے پاس جو دس بیگھے کا کھیت ہے۔"

"ہے۔"

"اس میں کیّاں کھود کے آلو بوائے دو۔۔۔۔ فصل ہے ابھی۔"

"اوّل تو کنواں کھودنے میں رد کرڈ لگتی ہے۔۔۔۔ پھر بیا بیارہ؟"

"کیا یار مجّو بھیا باتیں کرتے ہو۔۔۔۔ ہم پنچ تو جیسے مٹّی کے مادھو ہیں۔"

اور سارا اکھاڑہ اپنے یاروں کو پکارتا ہوا کھیت میں اتر پڑا۔ مگدر ہلانے اور ڈنڑ پیلیں لگانے کے بجائے سب کے سب پھاوڑے اور کدال لے کر جٹ گئے۔ شام ہوتے ہوتے پانی نکال لیا۔ دوسرے دن درجنوں بیریاں کھود کر کھیت کو روند دیا۔ تیسرے دن کیاریاں پڑنے لگیں۔ بکّن کے باپ نے کہا بھی کہ دس بیگھے آلو سنبھالنا تماشہ نہیں ہے لیکن لونڈوں نے ایک نہ سنی۔ آلو کا کھیت مجّو بھیا کی بیٹھک بن گیا۔ جو آتا چلم کا ایک دم لگاتا ایک بیڑی سلگاتا اور سو پچاس ڈول پانی کھینچ کر کھیت میں بہا دیتا۔ بوے دو بوے کی نکائی کر دیتا۔ بکّن کا باپ بفاتی جس نے فن کاشتکاری کے سائے میں آنکھ کھولی تھی اور داڑھی سفید کی تھی۔ اس کھیت کا نگہبان تھا۔ وہ بوڑھے فن کار کی طرح نکتے نکالتا اور مان پور کی ساری

جوان اور قوی ہیکل آبادی اپنا پسینہ بہاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگن کا مہینہ آگیا' دن سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ کھیت کے سرہانے کھڑے ہو کر مجّو بھیّا نے دو سیر جلیبیوں پر نذر دی۔ اور یاروں نے دو دو جلیبیاں منہ میں رکھ کر کھرپیاں سنبھال لیں اور یا دُبا دُ بھرکا آلو کھودنے لگے۔ مجّو بھیّا سڑک کے کنارے والی منڈیر پر کھٹیا ڈالے بیٹھے تھے۔ خیالوں کی چاندی کا خیمہ کھڑا کر رہے تھے کہ کلراواں کے مختارِ عام ہاتھی ایسے مشکی گھوڑے کی لگام کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔ مجّو بھیّا نے دعا سلام کا بہانہ بنا کر ان کو گھوڑا دیکھنے کے لئے اتار لیا۔ بچّن نے کھرپی کھٹیا پر رکھ کر گھوڑے کو گھورا۔

"مکھتار صاحب کتنے میں خریدا؟"

"کیا؟" مختارِ عام نے لونڈے کو گھور کر دیکھا۔

"گھوڑا۔"

"گودی بھر کے لگا ہے بچو۔"

"مگر گن تو لیا ہو گا؟"

"ہاں چھ سو کا ہے۔" اور مکّس کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ سُن لیا۔

"بس . . . . بڑے سستے ہوتے ہیں گھوڑے اپن نے تو جانا تھا کہ ہجار دو ہجار کا ہو گا۔"

"تو باندھ لو دو چار۔"

"رسید لکھوگے . . . . منگاؤں کاگذ۔"

"اچھا بچو...... منگاؤ...... تم بھی کیا یاد کروگے — مگر سوا چھ سو لوں گا۔"

"ہم تو سمجھتا رصاحب ساڑھے چھ سو تک دے مرتے...... مگر اب تو تم بات ہی ہار گئے۔"

بکّن تیر کی طرح گھر گیا۔ ماں کے ازاربند سے کنجی کھولی وہ ہاں ہاں کرتی رہی۔ اور اس نے کوٹھری سے بانس کی پٹاری نکال کر آنو کی گاڑیوں والا روپیہ گننا شروع کر دیا۔ پھر چھوٹے خاں کو ساتھ لے کر پہنچا اور بات کی بات میں پہاڑ ایسا گھوڑا کھینچ کر سنسان کوٹھری میں پہنچا دیا۔ جس کے دونوں طرف دروازوں کے بجائے ٹٹیاں لگی تھیں۔ مجّو بھیا کو اس وقت ہوش آیا جب گھوڑے اور بیارے کا چکتا کر کے کوئی دو ہزار روپیہ ان کے باپ کی صندوقچی میں چھنچھنا رہا تھا۔ وہ باہری کمرے کے تخت کی کثیف جاجم پر بیٹھے تھے۔ کونے پر رکھی ہوئی لالٹین کی زرد روشنی میں ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دو ہزار روپے کا ڈھیر لگا تھا۔ چاندی کا یہ ڈھیر نور کے پتلے کی طرح ان کی قلبِ ماہیت کر رہا تھا۔ انھوں نے ایک سچے مرید کی طرح اس کے ارشادات کو اپنے دل کی گرہ میں باندھ لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بجائے اکھاڑے پر جانے کے انھوں نے اپنے باپ کے وقت کے بچوس ہرداہے طلب کیے۔ ان کو ٹھنڈی آواز میں جواب دیا۔ اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے بیٹے جوڑے ہاتھ پیر والے دس نوکر بھرتی کیے۔ ان کو سفید قمیصیں، نیچی دھوتیاں، لال انگوچھے اور چرمرے جوتے پہنائے اور شام کو بکس سے ترکاریاں بونے کے فن پر تبادلۂ خیالات کیا۔ چھوٹے خاں نے سمجھایا کہ نوکر ایک گاؤں

کے ہوتے تو اچھا تھا۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ نوکر غریب گھروں کے ہوں تاکہ داب سہہ سکیں۔ لیکن مجّو بھیا نے اپنی فہرست پر نظر ثانی نہ کی۔ اور جوار کے اہم ترین گاؤں کے اہم گھرانوں کے نوجوان اور سرکش پاسی چماروں کا دستہ برقرار رہا۔ مجّو بھیا ان کے ساتھ ڈنڈیں لگاتے۔ بھگوئے ہوئے چنے کھاتے ان کے غموں میں آنسو بہاتے، ان کی خوشیوں میں قہقہے لگاتے۔ دن گزر رہے تھے۔ کھیت چاندی اگلنے لگے۔ دو دروازوں کی مختصر سی کوٹھری وسیع ہو کر اصطبل بن گئی۔ اور اس میں تین رنگوں کے گھوڑے ہنہنانے لگے۔ نوکروں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ شیخ منصور علی کے آبائی مکان کی مشرقی دیوار ڈھا دی گئی۔ اور کٹھل کے باغ کی دانتی تک سارا رقبہ گھیر لیا گیا۔ اس میں نئے کمرے بنے، دالان کھڑے ہوئے پھر سارا مردانہ سفید قلعی کے برّاق کپڑے پہن کر اترانے لگا۔ کوٹھریوں اور کمروں میں بھرا ہوا مردہ فرنیچر رام لکھن بڑھئی کے علاج میں دے دیا گیا جس نے سیروں اسپرٹ اور چپڑہ پلا کر اسے زندہ کر دیا اور مان پور کے سب سے بڑے آدمی کا سب سے بڑا مکان دور سے نظر آنے لگا۔

الوداع کے دن حافظ چھنگا نے بڑی کوشش کی لیکن جمعہ پڑھانے کے لئے مسجد تک نہ آ سکے۔ انصاریوں کے چودھری منیر بخش نے چھوٹے خان کے کان میں گھس سے کچھ کہا اور اٹھ کر بیچ کے در میں بیٹھے ہوئے مجّو بھیا کو ان کے کرتے کی چنی ہوئی آستین پکڑ کر اٹھایا اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ مجّا قصائی نے لپک کر اپنے بوڑھے ہاتھوں

سے اپنی پگڑی اتاری اور مجّو بھیا کے کامدار پلّے پر لپیٹ دی۔ مجّو بھیا نے طاق پر رکھی ہوئی کتاب اٹھالی اور ٹھنڈی آواز میں خطبہ شروع کر دیا۔ گویا شیخ کو آموختہ سنا رہے ہیں۔ پھر مان پور کی کچی عیدگاہ کے صحن میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بغیر ڈاڑھی کے نوجوان مجّو بھیا کی امامت میں صف آرا ہو گیا۔ چھوٹے خاں نے جب گرج کر تکبیر کہی تو ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے حافظ چھنگا کی بیمار آنکھیں پھاٹ پڑیں۔ مجّو بھیا نے مان پور اور اس کے جوار کے مسلمانوں کا احترام کیا اور نوجوان درگا سہائے کو چکمہ دے کر مسجد کے سامنے کی ساری زمین اپنی نجی ضرورت کے لیے خرید لی۔ رجسٹری ہوتے ہی اپنی جیب سے مسجد میں پیوندکاری کی طرح ڈال دی۔ درگا سہائے نے یہ خبر جو سنی تو آگ ہو گئے۔ پچاس آدمیوں کو چار دن بندوقیں دے کر مان پور پر چڑھ آئے۔ مجّو بھیا کو سن گن مل چکی تھی۔ ایک ہی للکار میں سارا جوان مان پور ڈھاٹے باندھ کر کیل کانٹے سے لیس ہو کر دوڑ پڑا اور مجّو بھیا کے "دوارے" ان گنت راتوں کی مچھلیاں اور گرم نگاہوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ بوڑھے بوڑھے آدمی چپ سادھے بے قرار قدموں سے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے — کانگریسی راج کے سامنے پہلی بار مان پور نے سر اٹھایا تھا۔ تجربے کار ہندوؤں نے بستی کے ڈانڈے پر نیم دائرہ بنا کر ہاتھی کو روک لیا۔ ہل کھانے درگا سہائے کو رتی رتی حال بتا کر قانونی اونچ نیچ سمجھائی۔ ان کی چھاتی کے شعلے تو کم ہو گئے لیکن آگ لگی رہی۔ شیخ سرور علی مختارِ عام کے مرنے کے بعد پہلی بار درگا سہائے

مان پور آئے تھے۔ بڑی "ہچر مچر" کے بعد ہاتھی مجّو بھیا کے چبوترے پر لگا دیا گیا۔
سپاہیوں کی باہنوں پر رکھی ہوئی سیڑھی کے بیک ڈنڈوں پر پاؤں رکھ کر درگا سہائے
اتر آئے۔ مجّو بھیا نے سلام کر کے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دالان میں آئے۔ ان
کو آرام کرسی پر بٹھا کر نئے سیٹ میں برف کا شربت پلوایا۔ لکھنؤ سے خریدی ہوئی نئی
سنک کی ہنال پیش کی۔ آم کے بور کٹھل کی فصل اور گیہوں کے بھاؤ پر باتیں کیں۔ ہاتھی
پر چڑھتے ہوئے درگا سہائے نے مجمع کے چہرے پر سرکشی کی ایک سی عبارت پڑھ لی۔
اور مستعد ہو کر چاروں بندوقوں کو عقب میں لئے ہوئے چلے گئے۔ جب سڑک
کی موڑ کے اندھیارے میں ہاتھی کھو گیا تب مان پور کے بوڑھے چہروں پر بحالی آئی
اور جوانوں کے سینے اور پھول گئے۔ دھیرے دھیرے بستی کے چوپالوں کی عدالتیں
مجّو بھیا کے دالانوں میں ضم ہو گئیں۔ یہاں پٹواری کے کاغذات سے لے کر دیور
بھاوجوں کے تعلقات تک درست ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مان پور کے بنیوں
کی بھٹیوں کے کفن سوکھنے لگے۔ دس دس روپے پر دس دن میں دو دو روپے سود ادا
کرنے والے گودی بھر بھر کر روپیہ لے جاتے اور کوڑی کوڑی چھوڑ کر ادا کرتے مگر مجّو بھیاّ
کی تیوری پر بل نہ آتا۔ بہتوں نے تو مار بھی لیا۔ لیکن کچہری عدالت کا تو کیا ذکر مجو بھیّا
نے منھ سے کچی بات بھی نہ کہی۔ مان پور ان کو دل سے زیادہ نگاہ کا سچا سمجھتا تھا۔ گھر میں
جب بسیارہ بنایا جاتا اور عورتوں کے ریوڑ لق ودق آنگن میں پھیلا پچھیوں کی طرح
کلیلیں کرتے تو وہ کمرے میں لیٹے کڑیاں گنا کرتے۔ سنسناتی دوپہروں میں جب ڈھونڈ کر

تک اپنے بھائوں پر یا درختوں کے سایوں میں جگالی بھول کر آنکھیں میچ لیتے تو انکے ہاہاہوہو کرتے مکان میں رجب کی اماں کی سبک سجل پوتیاں نواسیاں ٹھپے توڑے بجایا کرتیں۔ پاس پڑوس کی بانکی ترچھی مانگی بیاہی عورتیں کھلے ڈھکے سے بے نیاز ممّو بھیا کو دودھ پیتا سمجھ کر ٹھٹھے لگایا کرتیں۔ چھیڑ چھاڑ کر کے وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ رجب کی اماں گالیوں کا آموختہ سنانے بیٹھ جاتیں۔ مگر ممّو بھیا مورتی کی طرح بیٹھے رہتے۔ جوان جہان ممّو بھیا آنگن میں دھم دھم کرتے آتے تب بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ عورتیں اپنے جونک ایسے بچوں کو دودھ پلایا کرتیں۔ گھٹنوں کی اندھوریوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پنڈول کا برادہ چھڑکتی رہتیں۔ کوئی بڑا لحاظ کرتی تو پاس پڑا ہوا موٹا موٹا دوپٹہ اٹھا کر بیٹوں سے گوندھے ہوئے سر پر ڈال لیتی بہت سی تو اس کی بھی زحمت نہ کرتیں۔ کالے خاں کی گوری دولہن موٹی موٹی لال لال برتو پر لگانے کے لیے آبنا ملدی لینے آئی۔ رجب کی اماں ابھی ڈبے ٹٹول رہی تھیں کہ بھیا آگئے۔ وہ اٹھی اور راستہ روک کر کندھوں تک اپنی کرتی الٹ دی اور برتیں دکھلا دیں۔ بھیا کنواریوں کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑے اس کی شکایت سنتے رہے۔ اندر چلے گئے۔ سڑک کے کنارے جوان عورتوں کو گھاس چھیلتے دیکھ کر وہ سایہ چھوڑ دیتے اور چلچلاتی دھوپ میں بھننے چلے آتے، اپنے باغ میں عورتوں کو اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر دور ہی سے واپس چلے آتے۔ یہ سب کچھ تھا مگر حاجی میٹھے کی دولہن للّی کو دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکن بگڑ جاتی۔ ہاتھ پیر سنسانے لگتے اور وہ اس جادو کو اپنے سر سے اُتار

پھینکنے کے لئے لنگوٹ باندھ کر ہزار پانچ سو ڈنڈیں نکال دیتے۔ گھوڑا کھینچ کر دس پانچ میل کا چکر لگا ڈالتے پھر بھی چین نہ آتا تو چار چھ بالٹیاں سر پر انڈیل لیتے۔
حاجی بیٹھے گھوڑے بیل کے تو حکیم تھے ہی۔ حج کے بعد معلوم نہیں کس سادھو نے کون سی بوٹی بتا دی کہ وہ برص کا علاج بھی کرنے لگے۔ پہلے پہل تو لوگوں نے ٹھٹھول جانا لیکن منّا دھوبی کے بھلے چنگے ہوتے ہی قادر کبڑیلے نے آنکھیں جھپکائیں اور ایک دن مسجد سے نکلتے ہی حاجی کو پکڑ لیا۔ اٹھارہ بیس سال کی جوان بہن للّی نے اپنا پیٹ اور کمر کھول کر حاجی بیٹھے کو دھبّے دکھلا دیئے۔ جواب میں حاجی نے قادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
"چالیس دن لگیں گے۔"
اور قادر کی آنکھوں میں تشکّر مسکرانے لگا۔ ابھی بیس بائیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ للّی کے گال کا داغ بجھنے لگا۔ چیت کی تپتی دوپہر تھی۔ للّی کھانا کھا کر کوٹھری میں گئی کہ لیپ لگا کر کو لیٹ رہے۔ مگر ٹین کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ باہر آئی تو باپ خرّاٹے لے رہا تھا ماں پڑوس میں گئی تھی۔ مجبوراً ڈبہ پکڑے پکڑے حاجی کے گھر چلی گئی۔ بروٹھے میں پیڑھی پر حاجی بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ چارخانے کے تہبند سے نکلی ہوئی بانس کی پنڈلیوں پر چیونٹوں کی طرح کالے کالے بال لسے ہوتے تھے۔ کالی داڑھی سینے کی ہڈیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ حقہ پینے میں ان کا پیٹ لہار کی دھونکنی کا منہ چڑا رہا تھا۔ املی کے بیجوں جیسی آنکھیں اٹھا کر انھوں نے للّی کو دیکھا۔ بائیں گال کو غور سے دیکھا لیکن دھبّہ

نظر نہ آیا۔ سُرخ گالوں پر لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے چھپتی ہوئی بغیر کاجل کے کالی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ سنسنا گئے۔ حاجی کی نظر جھک گئی لیکن پھر اٹھ کر للّی کے کولھوں پر پھنسی ہوئی کرتی سے لٹک گئی۔ حاجی میّتھے کے وجود کے اندر چھپا ہوا مرد آج کلثوم کی موت کے بعد پہلی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ حاجی نے خشک ہوتے ہوئے گلے کو دھوئیں سے ایک بار تر کر کے حقہ ہٹا دیا۔

"وہاں تروا ہے میں دوا کا مروا دھرا ہے۔"

حاجی نے آہستہ سے کہا اور کالے لہنگے کی گوٹ سے بیزار سفید پنڈلیوں کا رقص دیکھنے لگے۔

"ملا نا ہیں۔"

"نا ہیں۔"

حاجی اپنے مرتعش وجود کو گھسیٹتے ہوئے۔ تروا ہے کے پیچھے والے کمرے میں گھس گئے۔ مروا اٹھا کر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"لے۔"

زندگی میں پہلی بار للّی کو انجانا میٹھا میٹھا خوف محسوس ہوا . . . . جیسے وہ مرچوں سے لال آلو کھانے کے لئے چونے سے کٹا ہوا منھ کھول رہی تھی۔ حاجی نے کالی کالی دوا سے بھری انگلی اسکے بائیں گال کے پھول پر لگا دی۔ لگاتے رہے۔ وہ کھڑی رہی جیسے نٹ رسّی پر کھڑا ہو۔ پھر حاجی نے اس کی کرتی کا دامن بائیں ہاتھ کی چٹکی

سے پکڑ لیا۔ اور للّی کو ایسا لگا جیسے لال لال سلاخیں اس کی کمر سے چھو گئی ہوں۔ وہ
چھلاوے کی طرح تڑپ کر کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"دوا ڈبے میں دھر دو"

"للّی"

حاجی کی آواز کے ارتعاش نے خود ان کو چونکا دیا۔ للّی نے وحشی آنکھیں اٹھا کر
ان کو دیکھا۔

"تمہاری چھوٹی بہن کی گود میں چار لڑکے ہیں..... اور تمہارے ابھی ہاتھ
تک پیلے نہیں ہوئے..... تم بڑی پیاری ہو..... لیکن کون باپ اپنے آٹھ
برس کے بیٹے سے تم کو بیاہے گا..... تم کو جو لے گا..... وہ بیجار ہوگا.....
تو بوڑھا میں بھی نہیں ہوں للّی..... پھر کوڑھ کی دوا چالیس دن کی نہیں ہوتی...
... چالیس برس کی بھی نہیں ہوتی... عمر بھر کی ہوتی ہے..... عمر بھر کی
..... مان پور میں کوئی مائی کا لال ہے..... جو عمر بھر کا پھوڑا اپنے ہاتھ سے
اپنے کلیجے پر باندھے گا..... میرے نہ لڑکے ہیں.... نہ بالے.... نہ گوشت
روٹی جڑتی —— اور نہ جینا چاہتا ہوں۔ بولو۔ للّی۔ بولو ہے منظور ؟"

حاجی بڑھتے ہوئے چلے گئے۔ دوا والی انگلی تہبند میں پونچھ لی۔ پھر للّی
نے محسوس کیا کہ حاجی کی داڑھی کے کالے کالے بال اس کے گریبان میں
گڑ رہے ہیں۔

پھر ایک جمعہ کو قادر نے للّی کو پانچ کپڑے اور سات برتن دے کر حاجی میٹھے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ شادی کے بعد جو للّی باہر نکلی تو مان پور چونک پڑا۔ لوہے کی بالٹی پر سونے کی قلعی ہو گئی تھی۔ سارنگی کے تاروں کی طرح کسا ہوا انگ انگ بجنے لگا تھا۔ جب بیٹھی لوکیوں کا جھوّا سر پر رکھ کر جب وہ شرماتی ہوئی بازار میں پہنچی تو دور دور تک دلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ کسی کو یقین نہ آتا کہ یہ قادر پھوپھا کی وہی لونڈیا للّی ہے جس کے ہاتھ کی چلم پیتے ابکائیاں آتی تھیں۔ للّی کے مہندی لگے ہاتھ اس وقت تک ناچتے رہے جب تک جھوا دیکھنے والوں کی چھاتیوں کی طرح خالی نہ ہو گیا۔ حاجی میٹھے چونک پڑے۔ ایک دن للّی نے حاجی کے سر سے جھوّا اتروایا تو اس میں سے مارکین کا ٹکڑا اگر پڑا۔

"یو کا ہے حاجی؟"

"تیری شلوار کے لئے لایا ہوں.... لہنگا کرتی بڑا ننگا پہناوا ہے۔"

"ہوں!"

للّی نے کپڑا اٹھایا اور پاؤں پٹختی ہوئی گئی۔ کپڑا چولھے میں جھونک دیا۔

"میاں جی.... میں بیاہ کے آئی ہوں نہ پتریا ہوں نہ لونڈی!"

حاجی اپنی چیاں سی آنکھیں جھپکاتے رہے۔ اس دن کے بعد حاجی نے للّی سے کبھی نہ پوچھا کہ کل تو نے فجّو خاں کے گھونسہ کیوں مارا تھا۔ یا بخّن کے ساتھ تندولے میں بیٹھی دو گھنٹے تک کیا باتیں جٹیلتی رہی۔ حاجی بازار اور نماز کے علاوہ کسی بات

کو اپنی توجہ کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔

یوں تو سارا جوان مان پوَرنَدیدے لڑکوں کی طرح اس کے بدن کو گھورا کرتا لیکن تراب کی آنکھیں جب اس کی کرتی کے فراز پر پڑتیں تو اس کی جان میں بھنگرے لگ جاتے۔ معلوم نہیں کیوں للّی کو اس کی ننگی نظریں کوئی ذلیل منصوبہ بُنتی ہوئی نظر آتیں اس تصوّر کے آتے ہی اس کی فطری شعلہ مزاجی پر تیل کی دھار گر پڑتی۔ اور وہ حاجی کی کسی بات کسی حرکت کو بہانہ بنا کر ان کے ایسے ایسے لَکھان کرتی کر وہ بے چارے کھونٹی سے تسبیح اٹھا کر مسجد چلے جاتے یا کھرپی لے کر اپنے کھیت میں جا بیٹھتے۔ مگر اس کی آگ نہ بجھتی اور وہ دوپٹے کی بے نیازی سے بے نیاز پاؤں پٹختی ہوئی تائیں تجّو بھیا کے پاس پہنچ جاتی۔ تجّو بھیا چاہے ڈنڈیں لگا رہے ہوں۔ چاہے کھانا کھا رہے ہوں چاہے بنے بسیارے کا مسئلہ لئے بیٹھے ہوں چاہے لگام ہاتھ میں لے کر رکاب میں پاؤں ڈال چکے ہوں۔ للّی کو دیکھ کر بدمزاج ماں کے سفید بچے کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کی ہر بات کی تائید کرنے اور نظریں جھکائے جھکائے حاجی میٹھے کو ڈانٹنے کا وعدہ کر لیتے۔ اور اپنی ھنڈی نگاہوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ للّی کی کرتی سے جھانکتی ہوئی کمر سے کھینچ لاتے۔

بقرعید کا مہینہ ڈوب رہا تھا۔ پہلے پانی کے دن تھے۔ حاجی میٹھے خربوزوں کا جھوّا اٹھوا کر جمعہ کی وجہ سے جلدی چلے گئے۔ للّی کیان کے جھالے میں باہوں کے خنجر دھو رہی تھی۔ آستینوں کے نیام الٹے پڑے تھے، کانوں میں جھولتے ہوئے بڑے بڑے جھمکے بڑا کر اب وہ منہ دھونے لگی تھی۔ کہ اس کی منارکہ مرغیاں زور زور سے کڑکڑانے

لگیں۔ وہ چونک پڑی کہ کہیں منگو قصائی کی بچھیاں تو نہیں گھس آئی ہیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کے پٹ کھلے تھے اس کی دہلیز پر کتا لیٹا ہوا تھا۔ آنگن میں بورے پر پھیلے ہوئے لال لال مرچے چمک رہے تھے۔ اس کے چبوترے کے برابر منگو قصائی کے دروازے کے اوٹ پر تراب بیٹھا ہوا تھا۔ للّی نے اسے دیکھتے ہوئے پاکر آنکھیں جھکا لیں اور ہاتھ سست پڑ گئے۔ لانبا آدمی اوٹے پر بیٹھا ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑا ہو۔ دھنّی ایسے ہاتھ پاؤں ..... دیوار کی طرح چوڑا چکلا تراب جب سڑک پر راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا تو للّی کو گردن اٹھا کر اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھنا پڑتا۔ تراب کو وہ کنوارپن میں بھی دیکھ چکی تھی۔ محرم میں بانا گھماتے ہوئے، ہولی میں نقل بتاتے ہوئے عیدگاہ کے کنوئیں پر" وضو بناتے ہوئے" لیکن اب تو اسے دیکھتے ہی للّی کا خون کھولنے لگتا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ وہی تراب ہے جسے بھیکم پور کے گدّی گدّیوں کی ناک کہتے ہیں جس کے ہاتھ پیروں کی باڑ دیکھ کر گدّیوں نے ایک بھینس وقف کر دی تھی کہ تراب دودھ پئے اور محنت لگائے۔ یہ وہی تراب تھا جس نے دن دہاڑے بھکّا باسی کی دولہن اٹھا کر اپنے گھر میں ڈال لی تھی۔ اور میلوں تک پھیلے ہوئے پاسیوں کے گاؤں بس ٹکر ٹکر دیکھا کیے تھے۔ یہ وہی تراب تھا جس نے منگو ایسے سرکش قصائی کی چاند ایسی دولہن پر چھاپا مار لیا تھا۔ کہنے کو تو منگو اب بھی کہتا تھا کہ تراب سے اس کی بیوی کی نہیں اس کی خود کی یاری ہے لیکن مان پور والے جانتے تھے کہ تراب چندہ کے ساتھ کوٹھری کے دروازے بند کر کے نماز نہیں پڑھتا ہے۔

للّی بیٹھی ہوئی نہ جانے کب تک یہی الّم غلّم سوچا کرتی کہ چھڑوں کی طرح بڑے بڑے بوند پڑنے لگے۔ اس نے گردن اٹھا کر بھونرا ایسا سیاہ بادل دیکھا اور نتھنی میں پھنسی ہوئی بالو کی لٹ درست کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ پھر اپنے نئے لہنگے اور رنگی ہوئی کرتی کے خیال سے خربوزوں کا جھوّا اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور دھچکتی ہوئی چلی۔ دو چار ہی قدم گئی تھی کہ حاجی کے چادرے پر نظر پڑی۔ مجبوراً رک گئی۔ چادرے کا اڑوا بنا کر سر پر رکھا اور بھونک دے کر جھوّے کو اس پر دھر لیا۔ دو خربوزے گر بھی پڑے مگر وہ بھیگتی ہوئی اور بھاگتی ہوئی چلی ہی گئی۔ بوجھ کی وجہ سے کھیت کی خندق پار کرنا مشکل تھا اس لیے چکر کاٹ کر وہ منگو قصائی کے دروازے سے نکلی۔ تراب کی بھوری آنکھیں اپنی کرتی پر جمی دیکھ کر اس نے دوپٹہ درست کرنے کی کوشش کی لیکن بھیگی ہوئی زمین پر بھاری جھوّے کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"خربوزے بکاؤ ہیں"

جیسے بیٹرے کے ڈھول پختہ سڑک پر لڑھک رہے ہوں۔

وہ بغیر جواب دیئے تیز تیز قدموں سے نکلی جا رہی تھی کہ ایک فقرہ جوتے کی طرح اس کے منہ پر آ پڑا۔

"اور یہ کرتی والے"

وہ جھنجھنا اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ جھوّا پھینک کر اس مرچھے کا منہ نوچ لے۔ لیکن کسی نے اس کے جھمکے کے پاس منہ لا کر آہستہ سے کہا کہ للّی یہ فجّو خاں ہے نہ بکس ....

یہ تراب ہے تراب۔" اس نے زندگی میں پہلی بار یہ گندا فقرہ سنا تھا۔ حاجی میٹھے حاجی تو تھے ہی لیکن وہ مان پور کی سب سے بڑی برادری کے چودھری کے بھائی بھی تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ موقعہ بے موقعہ بگڑ کر حاجی کو بیمارے کی کوٹھڑی میں بند بھی کر دیتی ہے۔ لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ حاجی سے اس تضحیک آمیز موضوع پر گفتگو کرتا یا للّی سے اشارتاً کنایتاً بھی ذکر کرتا۔ اس فضا میں پلی ہوئی للّی تراب کے فقرے کو بھول نہیں پائی۔ جب پہلی بار اس نے تراب کی جلتی ہوئی نظریں اپنے بدن کے نازک خطوط پر محسوس کی تھیں۔ تبھی اس نے باتوں باتوں میں بکّس سے ذکر کیا تھا۔ لیکن بکّس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ بکّس مان پور کا سب سے بہیڑا اور لڑاکا جوان جس کے بدن میں آگ بھری ہے جس کا غصہ برساتی نالے کی طرح چڑھتا رہتا۔ وہ ایسی بات پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیسے بیٹھا رہا۔ وہ سوچتی رہی اور چولھے پر چڑھی ہانڈی کی طرح کھولتی رہی۔ ایک بار اس کی نظر چھینکے پر دھری روٹی کی طرف اٹھ بھی گئی لیکن آج بھوک کہاں تھی۔ وہ چارپائی توڑتی رہی۔ حاجی نماز پڑھ کر آئے اور بھوا ترازو لیکر بازار کو چلے بھی گئے مگر وہ چارپائی توڑتی رہی۔

"حاجی چچا..... ہوت"

للّی دلارے پاسی کی آواز سن کر بجلی کی طرح اٹھی ہاتھ چارپائی کے مچّے سے پر جھولتے ہوئے دوپٹے پر خود بخود پڑ گیا۔ لیکن اس نے اسے چھو کر چھوڑ دیا۔ اور بڑے لاڈ سے بولی۔

کون دلارے ؟"

"ہاں چچی ۔۔۔۔۔"

"چلے آؤ"

رام دین دلارے کا چھوٹا بھائی مجّو بھیاّ کا نوکر تھا اور مجّو بھیاّ للّی کا کچھ اس قدر احترام کرتے کہ دلارے بھی رام دین کی طرح للّی کے چھجاتے منہ پر آنکھیں نہ گاڑ پاتا۔ ویسے دل اس کا بھی للّی کو دیکھ کر دھڑک اٹھتا تھا۔ آج للّی کی آواز میں گڑ کی مٹھاس پاکر وہ بھونچکا ہو گیا۔ پھر اپنے گولے دار لاٹھی دروازے کے کواڑ سے ٹکا کر مٹیالے جوتے بھیگے آنگن پر ہولے ہولے دھرتا ہوا چھپر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

"تم تو ایسا منہ لٹکائے کھڑے رہو جیسے دلہن بھکّا کی نائیں تمری اٹھائے گئی"

دلارے نے چھاتی کھجلا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"چچی تم سے یا امید نائیں رہے ۔۔۔۔ مُل اب تم ہوں جوتے مارے لگیو"

"جب تک تم آپ جیت ہیں جب تک جوتے مارے والی بات ہے یا ۔۔۔۔ کے دلارے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کے کہدیو ۔۔۔۔۔ کہ نائیں ہے"

"ہے ۔۔۔۔ چچی ۔۔۔۔ گلے گلے پانی مان ہے"

"کیسے آئے ہو"

"آئین کا ۔۔۔۔ تنی ادرک چھی ہے"

"ہاں ہے کا ہے نائیں"

اور کونے میں دھری ناند کی بھیگی بالو میں ہاتھ ڈال کر للّی نے ادرک کی گانٹھیں نکال لیں اور دلارے کے ہاتھ میں پکڑا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دلارے جس کی نگاہ بالو کی گرفت اس کے بدن پر سخت ہو گئی تھی ادرک پکڑ کر چونک پڑا۔ للّی نے بالو سے بھرے ہوئے ہاتھ اپنے داہنے گھٹنے پر باندھ لئے۔

"دلارے اب کی جمنی نائیں کھیَو۔"

"جتنی کھاؤ..... منّ جمنی ہیں۔"

"تو کھیئو..... اچھا کہاں کی کھیئو۔"

"تم چچی جہاں کی بتاؤ....... وہاں کی آن دی جانے۔"

دلارے مزے میں آ گیا تھا۔ للّی کے مسکراتے ہونٹ اور بولتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر "مجّو بھیّا" کا سایہ اس کے سر سے غائب ہو گیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اور ضرورت سے زیادہ جھک کر للّی کے لہنگے پر بالو کی انگلیاں جھاڑ دیں۔ للّی کے گھٹنے پہ ہاتھ پڑتے ہی دلارے کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے برف کی استری کر دی۔ اور پسینے میں ڈوبی ہوئی للّی کی خوشبو اس کی ناک میں آئی۔

"مکھن والے درخت کی جمنی لاؤ دلارے تو ہم جانیں کہ چچی کا بھتیجہ بڑا مرد ہے۔"

دلارے نے سیدھے ہو کر چچی کی کرتی سے جھانکتی ہوئی کمر کی دھار دیکھی اور ہاتھ کے گوچھے میں ادرک کی گانٹھیں سنبھالیں۔

"لائیب..... چچی لائیب۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ ابھی وہ آدھے آنگن ہی میں تھا کہ للّی نے کہا۔
"کہیں تراب تمہری دولہن نہ اٹھالے جائے۔"
دلارے نے گھوم کر للّی کو دیکھا ایک منٹ کے لیے ٹھٹھکا اور دھم دھم پاؤں
رکھتا چلا گیا۔

مان پور میں داخل ہونے والی سڑک کے دونوں طرف ایک قطار میں سب
سے پہلے قصائیوں کے مکانات تھے۔ جہاں سے گزرتے ہوئے ادھوں کے بیل
دندک اٹھتے تھے۔ آخری مکان منگلو کا تھا۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکان کی دیوار مشترکہ
تھی۔ اس دیوار میں دروازہ بھی تھا۔ جسے للّی عموماً بند رکھتی لیکن منگلو کی بیوی چندہ
یوں تو سارے مان پور کی سڑکیں چھپی کرتی تھی۔ لیکن للّی کے پاس جانے کے لئے وہ ہمیشہ
دروازہ کھلواتی تھی۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکانوں کے سامنے چھپانے کے کھیت تھے۔
ان کھیتوں نے ہی تراب اور چندہ کی محبت کو جنم بھی دیا تھا اور ان کا راز بھی فاش
کیا تھا۔ تراب رات کے اندھیرے میں انھیں کھیتوں کو روندتا ہوا چندہ کی چاندنی
لوٹنے جایا کرتا تھا۔ صبح جب حاجی میٹھے پھوٹی ہوئی لوکیوں کو دیکھتے تو نوکر پر بخار اتارتے۔
نوکر نے بڑے جتن سے تراب کو پکڑا لیکن تراب کو ہاتھ لگانا تو درکنار الاہنا دینا بھی
مصیبت بن سکتا تھا۔ نوکر بے چارہ چپ ہو رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حاجی بھی
چپ ہو رہے مگر قصائیوں کے ساتھ ساتھ کبڑیئے بھی تراب کے وجود کی دکھن محسوس

کرنے لگے تھے۔ آج صبح پٹیاپانی برسا تھا۔ للّی کا سارا چھپر تالاب بن گیا تھا۔ پانی ختم چکا تھا لیکن وہ کونڈا لئے پانی الیچ رہی تھی کہ چندہ نے دروازہ بھڑ بھڑایا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی اور دروازہ کھول دیا اور مڑ گئی۔ بیچ آنگن میں اسے "چھن چھن" کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ہاتھ سے چندہ نے اپنی شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک اٹھائے ہوئے تھے جس پر کڑھے ہوئے ہرے ہرے پھول اس کی گندمی پنڈلیوں پر بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ پھر اس کی نظر اس کی نئی جھانجھوں پر پڑی۔ اب تو وہ ٹھٹھک گئی۔ چندہ اپنے بھاری بدن کو سنبھالے ہوئے بڑے ٹھسّے سے اس کے برابر آگئی۔ اور للّی نے اپنے دل میں کہا "تو تر آب نے جھانجھیں بنوا ہی دیں بے چاری کو۔"

"چندی میکے سے آئی ہے۔"

للّی نے اس کی لہریا چندری کو دیکھ کر پوچھا۔

"اور نا ہیں تو منگو بنوائے دے رہیں۔"

"اری رومال ہیں کا ہے۔"

"پھلیندرے۔"

اور چندہ نے رومال کھول کر ڈلیا میں الٹ دیا۔ للّی نے کونڈا رکھ کر کھڑی ہوئی چارپائی بچھا دی۔ چندہ نے کاجل لگی آنکھیں مٹکا کر اسے دیکھا اور بیٹھ گئی۔

پھلیندرے تو مکھن والے پیڑ کے ہوت ہیں ...... ای تو سب جمنی ہیں ...

جے پور کے پاس خوب بیچت ہیں . . . . . . ترے لئے تو تراب لائے ہو ہیں . . . . ہم ہوں منگا دا ہے اب کی ."

"میرے لئے کا ہے لاتے . . . . . لانے تو منگلو کے لئے لاتے . . . . . پھر تر آب کوئی جمینداہ ہیں . . . . . او پیٹر تو . تجو بھیّا کے رسے پیَن کا ہے ."

"پیٹر تو پیسن کا ضرور ہے مل جمنی تر آبے کی ہیں ."

"ہو ہیں بھائی . . . . ہم کا کرے کا . . . . ہم تو مول کی کھائے کا ہے ." للّی نے مسکرا کر جمنی کی ڈبیا اٹھا کر کھٹیا پر رکھ دی۔ اور اپنے ہونٹوں پر مغرور مسکراہٹ کی سرخی لگالی۔ چندہ بڑی بے چینی سے سورج ڈوبنے کا انتظار کرتی رہی۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی اس نے منگلو کو کھلا کر اپنا پاپ کاٹ لیا۔ پھر منگلو کا پلنگ اٹھا کر چبوترے پر ڈال آئی۔ منگلو چھپر کے نیچے بیٹھا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ اور کلّی کرتا رہا۔ جب دری تکیہ رکھ کر کوٹھری میں پھر گئی تو منگلو بلّی کی طرح دبے پاؤں دروازے تک رینگ گیا۔ چندہ کونے آئینے میں اپنا منہ دیکھتے ہوئے پاکر وہ بے قرار ہو گیا۔ اور بھیڑیے کی طرح جھپٹ کر اس نے پیچھے سے اس کی چٹیا پکڑ لی اور دھم دھم دو گدّے اس کی پیٹھ پر جھاڑ دیے۔ پھر اس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ چندہ تھوڑی دیر تک دونوں ہاتھ پاؤں پر رکھے ہوئے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھورتی رہی پھر چھن چھن کرتی ہوئی نکلی اور باہری دروازے میں کنڈی لگا کر اپنے پلنگ پر پڑی رہی۔ ابھی عشا کی نماز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انتظار کرتے کرتے چندہ کی جان پر آبنی

تھی۔ خدا خدا کر کے دھما کا ہوا اور آدمی بھر اونچی دیوار پھاند کر ترآب آہی گیا۔
چندہ کے پلنگ پر بیٹھتے ہی پٹی جھک گئی۔

"سب خیر ہے"

اس نے اپنا پستول تکیہ کے پاس رکھ کر چندہ کے گورے پیالے سے گالوں کو دبوچ لیا۔

"تم بڑے بے ایمان ہو" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"کا ہے" بھوری بھوری مونچھوں کے نیچے پیلے پیلے دانت چمک اٹھے۔

"تمرے کوئی بھلیندرے کا بروا ہے"

"ہے"

"اور تم آج تک نائیں کھلایو...... تمرے بروا میں چھائیں نائیں ہے"

"پرسال ای فصل ماں تم کہاں ملی رہو...... اب پیٹ بھر کے کھایو...

... پیٹ بھر کے باٹیو"

"ہوں پیسیئے سب تھوڑے بیچے ڈارت ہیں..... ہم پیٹ بھر کے جرور کھیبا"

"ارے اوکا کوئی چھوئی نائیں سکت ہے"

چندہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن ترآب سے مجبور ہو گئی۔ چندہ کے جی کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"یہ پڑوسن تمری بڑی جالم ہے"
" تراب نے چندہ کی چھانجھ سہلاتے ہوئے کہا۔"
"تم بلا وجہ پیچھے پڑے ہو اُدکے ...... اُدکے کوڑھ ہے ... نہیں تو حاجی میٹھے کے پلّے کا ہے بندھتی کوئی جوان جہان نہ جڑتا!"
"اب نائیں چندہ .... اب نائیں ہے اَدکے کوڑھ ...... اور چندہ تم اگر ساتھ دے جاؤ تو میں ای کا مان توڑ کے رکھ دیوں۔"
"تو کا میں کوئی باہر ہوں۔"

اور یہ رات للّی پر بڑی بھاری گزری۔ حاجی میٹھے عشا کی نماز کے بعد آنگن میں ٹہل ٹہل کر تسبیح پڑھتے رہے۔ پھر اپنی چارپائی پر کورے گھڑے کا پانی بہا کر لیٹ رہے اور خراٹوں میں ڈوب گئے مگر للّی تڑپتی رہی۔ تراب کا فقرہ بجرجی کے موسل کی طرح اس کی چھاتی پر چلتا رہا اور وہ تڑپتی رہی۔ ابھی اندھیرا تھا کہ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس نے اپنی چارپائی پر آدھے لٹک کر حاجی کو جھنجھوڑا جو کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ چھپر کی الگنی سے کرتا، طاق سے دتون اٹھا کر ٹوپی دیتے ہوئے نکل گئے۔ کڑکڑاتی ہوئی مرغیوں کے جھوّے کی سل اٹھاتے ہوئے ایک خیال نے للّی کے ذہن میں چٹکی لی اور وہ بڑی تمکنت سے چارپائی کے سرہانے سے دوپٹہ اٹھاتی ہوئی باہری دروازے سے پر آگئی۔ صبح کا دودھیا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خنک ہوا مٹی اور درختوں کی

خوشبو سے بوجھل تھی۔ وہ سدھائی ہوئی ہرنی کی طرح نم پگڈنڈیوں پر اڑتی ہوئی تجو بھیاّ کے بار میں آگئی جس کی دانتی پر کٹھل کا باغ تھا۔ اس میں درخت تو کم تھے لیکن رقبہ بہت تھا اور اس کی گھاس بھیکم پوروالوں نے اپنے جانوروں کے لیے خرید لی تھی۔ اس کے پاس ہی مجو بھیاّ کی ادکھ کی پیڑی تھی۔ وہ اسی کھیت کی مینڈ پر آکر بیٹھ رہی — اجالا اور بڑھنے لگا۔ اکاّ دکاّ آدمی کھیتوں میں آتے جاتے نظر آنے لگے۔ للّی بھیکم پور کے گھروں پر نگاہ جمائے بیٹھی رہی، جو گھروندوں کی طرح دھندھلے دھندھلے نظر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھینسوں کا ایک غول طلوع ہوا۔ للّی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھینسیں ڈکراتی ہوئی گھنٹیاں بجاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی آرہی تھیں جیسے موٹی عورتیں چہل قدمی کرتی ہوں۔ پھر یہ غول باغ میں داخل ہو گیا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے آتا ہوا لڑکا ان کو ڈانٹ کر اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ للّی آہستہ سے اٹھی اور گھات لگاتی قیمرنی کی طرح جھکی جھکی چلتی رہی، باغ کی خندق کے پاس ہی سے اس نے بھینسوں کو کنکر مارنے شروع کیے۔ سب سے بڑی "مندراجی" بھینس کے آگے چلتے ہی سب کی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں۔ للّی ان کو گھیرتی ہوئی مجو بھیاّ کی اوکھ میں لے آئی جب ساری کی ساری کوئی بیس ۲۰ پچیس ۲۵ بھینسیں کھیت میں بکھر گئیں تب وہ مورتی کی طرح نپے تلے قدم رکھتی ہوئی اپنے کھیانے کی طرف ہولی۔ تھوڑی دور پر اس کو رام دین نظر آیا۔ جو دوسرے نوکروں کے ساتھ تجو بھیاّ کی ڈیوڑھی پر جا رہا تھا۔

"کون رام دین"

"ہاں .... ارے ای تو چچا ہیں .... کہاں سے بسیرے بسیرے"
میں تو سنے رہوں کہ پسیئے بڑے نمک حلال ہوت ہیں۔ اور مجو بھیا تو تم پیچھن
جان چھڑکت ہیں"

تو ہم کون نمک حرامی کے ڈارا"

رام دین نے کندھے سے لاٹھی اتار لی۔ اور چچا کے کڑے تیوروں کو بھانپتے ہوئے
دوسرے نوکر بھی تھم گئے۔

"ہو تو میں جانت ہوں کہ جان سب کا پیاری ہے ..... اور گدّن کا سامنے
پسیئے بے چارے کر پاتے تو راج دین کے گھرانے کی ناک کا ہے کٹتی۔ تُن اگر تم بھینسیں
ہانک آؤ تو گدّی کچھ توپ لگائے نائے وہیں ..... اب بھیا بجرو تو بھینسیں ہانکے
آوے سے رہے"

"کون بھینس .... کہاں بھینس چچا"

رام دین کی آواز میں گرمی آگئی اور نوکر بھی چوکنا ہوئے۔

"پیچھے گھومو .... میں کہت ہوں پیچھے گھوم کے دیکھو ..... اوئی بھینس ہیں
کوئی چیونٹی تو ہیں نائیں کہ دکھائی نہ دیں"

رام دین نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ بنایا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی گھما کر

دوڑ پڑا۔

"آؤ ہو...... ای کی بھینسن کی"

اور للّی ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی اپنے کھپانے کو پار کر کے دروازے پر آگئی۔

رام دین جس کا جوان خون للّی کی باتوں نے کھولا دیا تھا۔ جاتے ہی جاتے بھینسوں پر لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑا۔ نوکروں میں سب پاسی تھے...... راج پاسی۔ بھینسیں بے حواس ہو کر ڈکراتی ہوئی اپنے گاؤں کی طرف بھاگیں۔ تو انھوں نے گھیر کر ان پور کی سڑک پر ڈال دیا۔ گدّیوں کو خبر لگی تو وہ لاٹھیاں سونت سونت کر دوڑ پڑے اور ان پور کے ناکے پر بھینسیں روک لیں۔ رام دین کی پکار سن کر اس کے چچا بھتیجوں کے ساتھ سارا راجپورہ دوڑ پڑا۔ راجپورہ کی پکار پر مان پور کا بھکّا جس کی بہن دلّالے کو بیاہی تھی اور جس کی چھاتی گدّی کا نام سنتے ہی بھنکتی تھی۔ ایک ایک آدمی بٹور کر چڑھ دوڑا۔ گدّیوں نے لمبی ڈوری پھلتے جو دیکھی تو مصالحت پر اتر پڑے۔ مان پور نے جو یہ گرم بڑھتی تو استاد بدّی کے اکھاڑے والے بکّن اور فجّو خاں کی چھپّیا والے بانا گھماتے اور بلّم ہلاتے نکل پڑے۔ بوڑھا راج دین جس کی آنکھوں کے سامنے تراب نے بھکّا کی بیوی اٹھا کر اس کی پشتوں کی کمائی ہوئی آبرو کا گلا گھونٹ دیا تھا بہت سنبھل کر آیا تھا۔ راج دین کیا جو اسکے سارے پاسی نامی پاسی تراب کے لئے بارود بچھائے بیٹھے تھے۔ لیکن ایک تو گدّیوں کی طاقت کا اندازہ تھا پھر مان پور کا خوف تھا کہ یہ پانچ چھ ہزار کی بستی جس طرف ٹوٹ پڑی وہاں کھلیان لگ جائے گا۔

لیکن آج راج دین دیکھ رہا تھا کہ مجّو بھیّا کے نام پر لاٹھی اٹھانے والے پاسیوں
سامنے ان پور کی جھگڑی تک نہیں پھٹکے گی۔ اس نے آتے ہی ترآب کے بار
پیرا کو للکارا۔

"تائ..... ہم بھینسیں پکڑا ہے...... ہم ان کا کانجی ہاؤس ماں بن
کریا... تم وہاں سے چھڑائے لیو..... ہم سے اگر بھینس کی بات کریو تو پھر فوجدا
ہے... یو تم جانت ہو کہ فوجداری فوجداری ہے۔ ای ماں لڈّو نائیں بٹت ہیں
راج دین کی گرمی دیکھ کر ترآب جو سڑک کے کنارے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا
کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"ای گدّن کی بھینسیں ہیں راج دین۔"

"ہاں.... اور پیسیے لئے جات ہیں۔"

"تو پھر لئے جائیں۔"

"یا بات ہے.... تو سنبھو جاؤ۔"

راج دین کندھے پر پڑا ہوا چادرہ کھینچ کر سر پر باندھنے کے لئے لے ہی
گیا تھا کہ مجّو بھیّا کا مُشکی گھوڑا مجمع کو کائی کی طرح پھاڑتا ہوا راج دین کے سر پر کھڑ
ہو گیا۔ مجّو بھیّا سفید کرتا اور سفید چوڑی دار پائجامہ پہنے تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"کیا راج دین کر ٹر ٹر کرتے ہو۔"

"کتھا آپ سن چکے ہو۔"

"ہاں.... گدّیوں کے یہاں چارا نہیں ہوگا.... تمہارا کھیت چرا لیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا کیا یہ لوگ اپنی بھینسیں مروا ڈالتے۔ رآم دین۔

"بھیّا"

ادکھ کے چارا گوروں کے لئے چالیس آدمی نہیں مارے جاتے.... لے جانے دے ان کو بھینسیں"

"پیرا"

"کھیرو"

"کٹھل کے باغ میں بھینسیں نہیں آئیں گی اب"

"یہ کہہ کر انھوں نے گھوڑا موڑا جو ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

مان پور اور اس کے جوار کے ایک ایک دل میں مجّو بھیا کی شرافت، لیاقت اور انسانیت، کھونٹے کی طرح گڑ گئی۔ راج دین اور بھکا بڑی دیر تک چھپّر میں بیٹھے خاموشی سے چلم پیتے رہے۔ شکار ان کی لاٹھی کی زد پر آکر نکل گیا تھا۔ للی نے یہ خبر سنی تو منہ لٹک گیا۔ محرّم کی پہلی تاریخ تھی وہ پہننے کے لئے ہری کرتی رنگ رہی تھی۔ کرتی نچوڑ کر اس نے الگنی پر لٹکا دی۔ لیکن پھر اس سے اٹھا نہ گیا وہ چولھے کے پاس بیٹھی دست پنے سے زمین کھودتی رہی۔

مجّو بھیاّ زمیندار کے پوت تھے۔ آج کا نقشہ دیکھ کر غرور سے ان کی چھاتی چار

آگئی اور بڑھ گئی تھی۔ تراب کے بات کرنے کا انداز ان کو کبھی اچھا نہ لگا۔ وہ وا
دمی تھا جو ان کے دروازے کے سامنے سے سانڈ کی طرح جھومتا ہوا نکل جاتا۔ کبھی
دو انگلی اٹھا کر سلام کا بھی روادار نہ ہوتا۔ پھر تراب کی بھینسیں اکثر ان کے بار میں
دندناتی ہوئی گھس پڑتیں۔ بظاہر تو وہ کوئی خاص توجہ نہ دیتے۔ لیکن وہ جانتے
تھے کہ یہ حرکتیں ان کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مجروح کرنے کے لئے سوچ سمجھ کر کی
جاتی ہیں۔ پھر ہولی والے دن تو تراب نے کھل کر نوکروں سے کہہ دیا تھا کہ بڑے شیخ
کے بیٹے ہوں تو ہانک دیں آکر تراب کی بھینسیں۔ مجّو بھیا خون کا گھونٹ پی کر رہ
گئے تھے۔ آج انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس میں ان کی حکمت عملی ہی کا دخل تھا۔ وہ
جانتے تھے اگر فوجداری ہو گئی تو میں ایک فریق بن جاؤں گا اور قتل کے مقدمے میں
فریق کے معنی ان کو اچھی طرح معلوم تھے، اسی لئے وہ طرح دے گئے۔ مگر ایک بات
انھوں نے طے کر لی تھی۔ بھیکم پور اور مان پور کی سرحد پر ان کا ایک جونار کا کھیت
تھا، جس کی مینڈ تراب کے کھیت کو ان کے کھیت سے جدا کرتی تھی۔ اسی مینڈ پر
جامن کا وہ درخت تھا جو اپنے مزے کی وجہ سے سارے علاقے میں مکھن والے جامن
کے نام سے مشہور تھا۔ پٹواری کے کاغذات میں بھی مجّو بھیا کے نام درج تھا
لیکن جس دن سے مجّو بھیا نے اپنا کھیت راج دین پاسی کو بیر بچانے کی خدمت
کے صلے میں دیا تھا اس دن سے اس کے جامن تراب نے ہتھیا لیے تھے۔ جامن کون
ایسی نعمت تھے جن کے لیے مجّو بھیا کڑھتے لیکن یہ ان کے حق اور حکومت کا سوال

تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ بیڈھب تراب کے سامنے ان کے ہیٹھی بھڑ نہ کر کیا کر لیں گے۔
آج پاسیوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دیکھ کر ان کو اپنے بھیگے ہوئے دامن
کو سکھانے کی سوجھ گئی تھی۔ وہ اپنے باہری صحن میں گملوں کے گول دائرے میں آرام کرسی
ڈالے بیٹھے تھے۔ آسمان پر کالے کالے جامنوں کے کھلیان سے بادل لدے کھڑے
تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ محرم کے سلسلے میں تھانے سے آئے ہوئے
کانسٹبل کی خوراک حلوائی کو بھجوا کر وہ بیٹھے تھے۔ سارے نوکر اپنے اپنے کام میں لگے
تھے۔ رام دین ان کی پشت پہ بیٹھا بیڑی پی رہا تھا کہ راج دین بھکا اور دلارے
آگئے۔ سبھوں نے جھک کر سلام کیا۔

"آؤ بھیا"

اور ان تینوں آدمیوں نے اپنے جوتے اتارے اور گول دائرے میں مجو بھیا
کے پیروں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"رام دین"

"ہاں بھیا"

جب وہ اٹھ کر ان کے سامنے آگیا تو بڑے لاڈ سے جھڑکتے ہوئے مجو بھیا
بولے۔

"ابے یہ تو تیرے باپ ہیں۔ ان کو تو بغیر میرے کہے بیڑی پلادی ہوتی"
"باپ ہوں چاہے چچا ہوئیں...... بیڑی کوئی پیڑن میں تھوڑے لگت

ہیں جو ہم بیٹھے لٹا وا کرئی۔ آپ جیکا حکم دیوا د کا پلائے دئی"۔
مجوّ بھیا نے مسکرا کر راج دین کو دیکھا۔
"بھیّا تمہارا یہ لونڈا کنجوس ہے..... بہت بڑا کنجوس ہے..... تم ایسے
دل والے باپ کا بیٹا کیسے ہے یہ"۔
راج دین نے فخریہ اپنے بیٹے کو دیکھا۔ دلارے اور بھکاّ بھی ہنس پڑے۔
"کہو بھکاّ سب خیریت ہے...... تم کیسے آئے"۔
بھکاّ نے سوچتی ہوئی آنکھیں اٹھا کر راج دین کو دیکھا اور کھنکارا۔
"ای بھیا آئے ہیں ایک جرورت سے..... ہم کا اپنے سنگ لائے ہیں"۔
راج دین نے بہت چلا چلا کر کہا۔
"ہاں۔ ہاں۔ بولو"۔
"ای اپنا کمرہ بنوائے رہے ہیں۔ کڑی او ماں پڑ گئی ہیں کم..... تو لکڑی
اگر کہوں نگاہ ماں ہوئے تو"۔
راج دین دروازے پر للّی کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ کیونکہ بھیّا نے گردن گھما کر
جو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے وہ سبز ریشمی اوڑھنی کندھے پر ڈالے سبز کرتی کی بہار دکھاتی
سبز پڑا کے دار گوٹ کے لہنگے میں بھنور بناتی رانیوں کی طرح آ رہی تھی۔ گملوں
کی شاخوں کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے دونوں مرمریں ہاتھ کولھے پر رکھ لیے۔
"کا بھیاّ کچھ فیصلہ کرت ہیں"۔

اس نے بڑے ناز سے کہا لیکن بھیّا کچھ بولے نہیں وہ چاہتے تھے کہ بات ختم کرکے لوگ چلے جائیں تو للّی کو غور سے دیکھوں۔

"فقیر نائیں بنے بھیّا آج"

للّی نے پہلی بار آج بھیّا کو اتنی بیباکی سے اپنے سراپے کو گھورتے پایا تھا۔

"رجب کی اماں نے نہ ابھی ٹوپی رنگی نہ کلانی آئی"

بھیّا نے اپنے خشخشے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ پھر راج دین کی طرف مخاطب ہوئے۔

"تو بھکاّ کو کڑیوں کے لئے لکڑی چاہیے۔"

"ہاں بھیّا"

"ہے کہیں نگاہ میں"

"ہمری نگاہ کون ۔ ۔ ۔ جہاں آپ حکم دیو وہاں نگاہ دوڑائی جائے"

"اورے راج دین"

"بھیّا"

"پہاڑ ایسا پیڑ سامنے کھڑا ہے اور تم مارے مارے گھوم رہے ہو ۔ ۔ ۔ تمہاری نہر والے کھیت میں وہ جامن جو کھڑا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دھنیاں ہی دھنیاں ہیں اس میں"

"سانچ تو کہت ہو بھیّا"

"بھکاّ تم پیڑ کاٹ لیو"

"کا محسن والا پیڑ تم ان کا دیت ہو ۔ ۔ ۔ بھکاّ کا۔ للّی نے آنکھیں چمکا کر دخل دیا۔

"ہاں ...... کیوں ؟"

"کاہے اپنی آبرو مٹی ماں ملاوت ہو ..... جون اپنی سونا ایسی دولہن نہ بچائے پاؤ اُدھر آب سے ای پہاڑ ایسا پیڑ جرور چھین لے جیسے ...... ای پیڑ دے کاہے تو کوئی چمار کا نا کو جون ہاتھ پاؤں جوڑ کے بھلا کاٹ تو لے" یہ کہہ کر للّی نے اپنی چنری ڈھلکا دی۔ زہر میں بجھے ہوئے ایک بلّم سے راج دین، بھگّا، رام دین اور دلارے سب کے کلیجے چھید کردہ جاتے جاتے مڑ گئی۔

"میں بھیّا کے لئے ٹوپی اور کلائی لاوت ہوں ؟"

بڑی دیر تک سنّاٹا طاری رہا۔ مجّو بھیّا سمیت سب منہ بھلائے بیٹھے رہے۔ عصر کی اذان سن کر بھیّا اٹھے ان کے اٹھتے ہی راج دین کے ساتھ سب اٹھ پڑے۔ اور سلام کی رسم ادا کر کے نکل آئے۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی لیکن حاجی بازار سے واپس نہیں آئے تھے۔ للّی نے چانول لگا کر لالٹین کی چمنی جوڑی اور جلا کر کوٹھری میں گھس گئی۔ بانس کے بنے ہوئے کپڑے رکھنے کے پٹارے کے ڈھکنے پر سے آئینہ اٹھا کر اس نے اپنی چاندی کی سلائی سی مانگ پر ایک مطمئن نگاہ ڈالی اور کوٹھری بند کر دی۔ آگے آگے نوکر جھوا لئے آیا اس کے پیچھے حاجی تھے۔ انھوں نے ڈلیا ترازو کونے میں دھرا اور لوٹے میں پانی لے کر وضو بنانے لگے۔ للّی نے رنگی ہوئی ٹوپی اور کلائی اٹھائی تھی کہ اسے یاد آگیا۔

"بالا مئو کی بزار ہے کل ؟"

"ہاں ..... ہے ..... آدھی رات سے گاڑی ہانکی جیہیں۔"

"آدھی رات سے؟"

"او نہہ بچھلا ..... سے ہانکی جیہیں۔ لیکن اٹھے کا تو آدھی رات سے پڑیہے۔"

حاجی جھنجھلا گئے۔" اور ای جو بادل لدے کھڑے ہیں۔"

حاجی نے اکڑ کر سیاہ آسمان کو دیکھا اور ٹوپی پہن لی اور آدھے آنگن میں جا کر بولے۔

"کھل بورے ہیں کچھ مہری تھوڑے بھری گئی ہے۔"

"اچھا تو سنو ..... میں تنی لپک کے ببیّا کا ٹوپی اور کلائی دے آؤں ..

... تم اتنے دخصت کر یاں نماز پڑھ لیو۔"

للّی کا حکم سن کر حاجی پلٹ آئے اور چٹائی ڈھونڈنے لگے۔

مجّو بھیّا نوکروں کو رخصت کر کے اٹھے ہی تھے کہ چھوٹے خاں آگئے۔

"بچّا ! کو آپ کا پیام مل گیا تھا۔"

"ہاں مجّو خاں کو بھیجا تھا میں نے۔"

"اب آپ یہ بتائیے کہ محرّم میں کتنا پیسہ صرف ہوتا ہے۔"

"بھائی پار سال تین سو چالیس لگے تھے۔"

"تو اس سال آپ چار سو روپے خرچ کیجئے ..... لیکن محرّم کیجئے دھوم سے۔"

"ہونہہ ..... تو صبح گھڑی بھر بیٹھ جاؤ ..... حساب بنا لیا جائے۔"

"آجائیے گا۔"

مجّو بھیّا چھوٹے خاں کو رخصت کر کے گھر کے آنگن میں پہنچے تو باورچی خانے کی طرف سے للّی آ رہی تھی۔

"رجب کی اماں نائیں ہیں۔

"نذر نیاز دلانے گئی ہوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا ہے۔"

للّی نے ہاتھ بڑھا کر مجّو بھیّا کے ہاتھ میں ٹوپی پکڑا ئی ہی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بڑے بڑے بوندوں کا ریلا ٹوٹ پڑا۔ مجّو بھیّا دالان کی طرف لپکے مگر للّی نے جلدی جلدی آنگن میں جو کچھ پڑا تھا بین کر دالان میں کر دیا اور باورچی خانے کے در میں لٹکی ہوئی لالٹین پر جھپٹی لیکن وہ اس کے پہونچنے سے پہلے ہی بھڑک کر رہ گئی۔ بیٹھے پانی میں پورا آنگن پار کر کے وہ لالٹین دبائے ہوئی دالان میں آگئی جہاں اندھیرے میں مجّو بھیا کھڑے تھے۔

"دیا سلائی کہاں ہے بھیّا۔"

مکمل اندھیرے میں اس کی آواز کا شعلہ چمکا اور مجّو بھیّا چونک پڑے اور بڑی مشکل سے بولے۔

"کمرے میں تخت پر۔"

کڑ کڑا کے بجلی چمکی تو اپنی ریشمی چنری نچوڑتی ہوئی للّی نے دیکھا کہ مجّو بھیا کے دیدے اس کے گریبان پر چپک گئے ہیں۔ اس نے ٹٹول کر چنری تخت کے کونے پہ

رکھ دی اور کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"یہاں تو بھیا نہیں ہے۔"

مجّو بھیا اپنی شہتیر ایسی ٹانگوں پر پہاڑ سا بدن گھسیٹتے ہوئے اٹھے۔ کمرے کی دہلیز سے نکلتے ہی جلنے توے پر ان کا ہاتھ پڑ گیا اور دل اچک کر حلق میں لٹک گیا۔ سنسان راتوں کے ملبے خوابوں کی جگمگاتی ہوئی زندہ تعبیر ان کے بازوؤں کی گرفت میں دھڑک رہی تھی۔ وہ اس لالچی بچے کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ جیسے مٹھائی کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ ابھی وہ اپنے ہاتھوں میں بھری ہوئی آرزوؤں کی دولت ایک نظر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ شانوں سے ان کے ہاتھ تراش لئے گئے۔ پھر انھوں نے بجلی کی روشنی میں دیکھا للّی آنگن میں چھپ چھپ کرتی بھیگتی ہوئی چلی جا رہی تھی وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح تخت پر بیٹھ گئے۔ پانی بند ہو گیا۔ کسی نوکر نے لالٹین جلائی۔ رجب کی اماں نے دالان صاف کر کے تخت پر دسترخوان بچھایا۔ کھانا لگایا۔ پھر اٹھا لیا۔ نوکر نے بستر لگایا۔ مچھردان لگا کر کھڑا رہا پھر چلا گیا۔ باہر پہرے کا سپاہی مستعدی سے "جاگتے رہو۔ جاگتے رہو" کے نعرے لگاتا رہا۔ لیکن مجّو بھیا نے تخت چھوڑ کر نہ دیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ کوس رہے تھے۔ للّی جو چور اپے پر کھڑی ہو کر اپنے شوہر کے بکھان کرتی ہے۔ جس کی شعلہ مزاجی کے سامنے بڑے بڑے فقرے بازوں کی زبانیں گونگا اچک لے جاتا ہے۔ وہ للّی جو فتنہ نہ کھڑا کر دے وہ تھوڑا ہے۔ بکّس، فجو خاں اور استاد مدّی کیا سوچیں گے۔ رام دین اور لونڈے میر

متعلق کیا خیال کریں گے۔ وہ مان پور کی مسجد کا امام..... جس کے سامنے جوان جوان عورتیں کرتے دوپٹے سے بے نیاز بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو دودھ پلایا کرتی ہیں اور اپنے شوہروں کے قصے بیان کیا کرتی ہیں۔ میرا کیا ہوگا۔ عورتیں مجھ سے پردہ کرنے لگیں گی مرد میرے نام پر تھو کیں گے..... اور لونڈے رنگے یار پرتالیاں بجائیں گے۔ وہ بیقرار ہوکر اٹھ بیٹھے۔ کیچڑ سے بھرے آنگن میں کامدار مخملی جوتا پہنے وہ ٹہلتے رہے۔ ٹہلتے رہے لیکن للّی جو کچھ بکے گی صبح بکے گی۔ پھر صبح اس سے معافی مانگی جا سکتی ہے۔ منایا جا سکتا ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ پھر خیال آیا کہ آج تو حاجی میٹھے بالا موّ کی بازار کھٹلی لے کر جائیں گے۔ ترپال مانگنے آئے تھے شام کو...... وہ کچھ مطمئن ہو کر سوچتے رہے اور رات گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

للّی جب گھر پہنچی تو چولھا بجھ چکا تھا۔ وہ حاجی سے بولے بغیر ان کے ساتھ کرنے کے لئے روٹیاں پکاتی رہی۔ پھر موٹی موٹی روٹیاں گھی لگا کر ڈبے میں بند کر دیں۔ مٹی کے پیالے میں سوکھی ترکاری رکھ کر اس نے حاجی کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے پلنگ پر گر پڑی۔ حاجی اور ان کے ساجھے دار دوسرے چھپر میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے اور دوسرے دن کے بازار پر قیاس آرائی بھی ہو رہی تھی۔

حاجی نے جب اس کو جھنجھوڑ کر جگایا تو اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی جو اس کے بالوں کی طرح کالا تھا۔ اس نے جماہی لے کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

آسمان کا حال دیکھ رہے ہو حاجی؟

"ہاں... مل سودا ہوئے چکا ہے... سنگی سب تیار ہیں... چھتری تپال سب انتظام ہے اور دیکھو کوئی گھڑی بھر رات ہے اب۔ ہم ادھر سے رے زینب بہن کا پکار دیبا ادئی آئے کے لیٹ رہیں ہیں۔"

"تو دروازہ نہ بند کریں؟"

"نائیں... دروازہ ضرور بند کرو... مگر تنی چیت سویو۔"

اس نے کڑکڑاتے ہوئے جا کے دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر آ کر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ حاجی نے بلو عیدی کے گھر پہ ہانک لگائی۔ تین چار آوازوں کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ حاجی نے تھکا کر اس سے زینب کو گھر بھیجنے کی تاکید کی۔ اور ہر بار اس نے پنسیری بھر کر سر ہلا کر حامی بھر لی۔ لیکن دروازہ بند کرتے ہی اپنے پلنگ پر لڑھک گیا...

للی کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن نیند نہ آئی۔ کبھی تراب کی موذی مسکراہٹ اس کی چٹیا پر جو تاسل کر چلی جاتی اور کبھی مجو بھیا کی باہوں کے شیریں لمس سے خیالوں میں چاندنی چھٹک جاتی۔ ابھی وہ پوری طرح مسرور بھی نہ ہو پاتی کہ مجو بھیا کی شرماتی ہوئی آنکھیں اس سے کہتیں کہ چچی بکس کی طرح میں نے تجھے چھیڑنے کے لئے یہ حرکت کی تھی ورنہ تو یقین جان کہ میں تجھ کو چچی ہی سمجھتا ہوں۔ خیال کے اس سپنولے کے دل پر رینگتے ہی وہ زور سے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیتی۔

دروازے پر ٹھٹکی ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کنڈی کھول کر دروازہ جو کھولا تو دس پنے کی سی موٹی موٹی انگلیاں اس کی گردن میں جم گئیں۔ تراب نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کیا، داہنے ہاتھ سے للّی کی گردن دبوچے ہوئے منگلو کے گھر والے دروازے کی زنجیر کھول کر داخل ہو گیا۔

وہ خیں خیں کرتی رہی۔ تراب نے مسکرا مسکرا کر پانی بھرنے والی رسی میں اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اس کے منھ میں انگوچھا ٹھونس کر ایک لات مار کر پلنگ پر گرا دیا اور کوٹھری بند کر لی۔ للّی دل ہی دل میں صبح ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن جب تراب نے اسے گود میں بھر کر پھر اس کے پلنگ پر لا کر بٹھا دیا اور آپ اس کے دروازے کی زنجیر کھول کر باہر نکل گیا۔ اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد فجر کی اذان ہوئی۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر کسی نے دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر وہ اٹھی دروازہ کھولا تو مجّو بھیا کھڑے تھے جس ہاتھ سے وہ کواڑ پکڑے تھی اس کی کلائی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زخمی تھی۔ پھر مجّو بھیّا نے اس کی کرتی دیکھی جس میں لہریں جھول رہی تھیں۔

"یہ کیا ہوا!"

"کیا ہوا آخر"

مجّو بھیّا نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا اور للّی کی کلائی تھام لی۔ للّی ٹوٹے

ہوئے دروازے کی طرح ان کے دیوار ایسے سینے پر ٹک کر رونے لگی۔

راج دین نے ججو بھیا کے یہاں سے آتے ہی چار چار کوس تک سارے گاؤں کو خبر بھیج دی تھی کہ دوسرے دن بازار کے وقت پہنچ جائیں۔ دس ہی بجے سے آدمی گرنا شروع ہونے لگے۔ کوئی بارہ بجے تک راجپورہ کے ایک ایک گھر میں کیڑے مکوڑوں کی طرح آدمی بجبجانے لگا۔ اس کے بعد راجپورہ کے سامنے والے باغ میں آدمیوں کا کھلیان لگ گیا۔ ابھی دو نہیں بجا تھا کہ رام دین اور دلارے کلہاڑیاں لے کر مکھن والے پیڑ پر پہنچ گئے۔ اس کے پیڑی پر کلہاڑی مار کر جنگ کا ڈھول بجا دیا۔ بھیکم پور کے چماروں نے جو سودا سلف لینے مان پور کے بازار جا رہے تھے۔ یہ رنگ دیکھا تو الٹے پاؤں جا کر پیرا کے گھرانے کو خبر کر دی۔ پیرا اپنا ناریل لیکر چھپر سے نکلا تو آدمی سمٹنے لگے۔ کوئی چالیس پچاس آدمیوں کو عقب میں لئے تم آپ نے دیکھا کہ دو بونڈے کلہاڑی لئے کھلواڑ کر رہے ہیں تو وہ مسکرا دیا لیکن پیرا کی بوڑھی آنکھیں ایک منظم سازش کی تہہ تک پہنچ گئیں اس نے ناریل پاس کے آدمی کو پکڑا دیا۔ اور نرمی سے بولا۔

"پھلا پھولا پیڑ کیوں کاٹے ڈالت ہو بھئی"

"روک پاؤ تو روک لو"

پیرا اس جملہ کی دھار پر کھڑا تھا۔

کہ راجپورہ کے باغ سے پاسیوں کی آندھی چلتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی مان پور

کی طرف سے آدمیوں کے غول آتے نظر پڑے، تو اس کی ڈھارس بندھی۔ ساتھ ہی بھیکم پور سے بھی آدمی سمٹنے لگے تھے۔ چھوٹے خاں نے آتے ہی پاسیوں کو ڈانٹا کہ روز تم لوگ کوئی نہ کوئی بسنت بنایا کرتے ہو۔ یہ کس کا ہے۔ آواز آئی: مجّو بھیّا کا ہے۔ مجّو بھیّا کا نام سن کر چھوٹے خاں کچھ دھیمے پڑے۔ پھر گدیوں کی طرف سے نعرہ بلند ہوا کہ جس کا کھیت ہے اس کا درخت ہے۔ اس قانونی بات چیت میں جتنا وقت لگا اتنے وقت میں مکھن والے جامن کے پورب اور پچھم میں دور تک آدمی ہی آدمی نظر آنے لگا۔ پورب میں پاسی۔ پچھم میں گدّی۔ مان پور والے کبھی ادھر کی حامی بھرتے کبھی اُدھر کی۔ سنجیدہ کوئی نہ تھا۔ سب تماش بینی کرنے نکل پڑے تھے۔ ویسے ہاتھ کسی کا خالی نہیں تھا۔ بانے، پٹے، تلوار، بلّم، کانٹے، لاٹھی ہر چیز دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے محرم میں کرتب دکھانے آ گئے ہوں۔ مان پور کے مکھیا چھوٹے خاں نے آدمی بھیج کر مجّو بھیّا کو خبر کرا دی تھی۔ بھیّا نے اپنے سارے نوکروں کو پہلے ہی رام دین کی حمایت میں روانہ کر دیا تھا۔ خود نیا ڈوری دار جوتا پہنے صحن میں چرمر کر رہے تھے۔ مگر بھیگی ہوئی زمین پر جوتی کی مدھم آواز کی وجہ سے انھیں ٹہلنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ مبارک ڈھپالی نے آ کر خبر دی کہ ہندو مسلمان میں گڑبڑ مچا ہے۔ چھوٹے خاں بلا رہے ہیں۔ مجّو بھیا نے کوئی موٹی سی گالی دے کر اسے دھتکار دیا اور بولے کہ اگر ہندو مسلمان کا نام لیا تو اتنے جوتے ماروں گا کہ بھیجہ نکل جائے گا۔ مبارک نے مجّو بھیا کو بگڑتے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ کان دبا کر بھاگ لیا۔ مجّو بھیّا نے بڑے اطمینان سے اصطبل کھولا۔ سفید

گھوڑے کو جسے وہ بجلی کہتے تھے۔ باہر نکالا۔ اپنے ہاتھ سے کاٹھی رکھی اور اوڈنے پر کھڑے ہو کر سوار ہو گئے۔ اُسے "یرغہ" چلاتے ہوئے موقعہ پر پہنچ پاسیوں کی کثرت دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ رام دین نے کلہاڑی رکھ کر الف ہوتے ہوئے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ رام دین جس نے مجّو بھیا کے ساتھ ڈنڈیں لگائی تھیں۔ مگدر ہلائے تھے اکھلیا ان اٹھائے تھے اور گھوڑے خریدے تھے۔ مجّو بھیا کاٹھی پر تن کر بیٹھے اور کڑک کر بولے۔

"چھوٹے چچا"

"ہاں بھیا"

انھوں نے بٹوے سے لونگ لے کر ڈوری گھسیٹ لی۔

"آپ فجّو خاں، بخشی اور استاد مدّی کو لے کر مان پور چلے جائیے۔ محرّم ہے یہ ..... سیدھے چلے جائیے"

محرّم کا نام آتے ہی چھوٹے خاں چونک پڑے۔ بٹوہ اپنے کرتے کی جیب میں گھسیڑ کر لونڈوں کو ڈانٹا جو اڑیل بیلوں کی طرح ایک قدم چل کر ٹھٹھک گئے۔ جب مان پور کا بچہ بچہ چری کے کھیت تک پہنچ گیا تب مجّو بھیا نے اپنا گھوڑا اگدیوں کی طرف موڑا۔ جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"پیرا"۔ مجّو بھیا رکابوں پر کھڑے تھے۔

"کہیو"

"تمرے بہوئیں اور بیٹی دونوں ہیں شاید"

"نہیں"

ابھی ان کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بھیڑ کو چیر کر تراب باہر نکلا اور لاٹھی ادھار کر دوڑا۔ مجو بھیا، بھکا اور راج دین کے ہونٹوں پر ایک قسم کی زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ مجو بھیا نے اپنے ڈوری دار جوتے کی ایڑی بجلی کے پیٹ میں گاڑ دی اور رخ بدل کر مان پور والوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ لاٹ ایسے تراب کی گولے دار لاٹھی اور مجو بھیا کے گھوڑے کا فاصلہ دانت پیستے ہوئے پاسیوں کے کرپا ایسے ہاتھوں میں ناچتی گولے دار لاٹھیوں سے بھر گیا۔ دلادے نے اپنی دھوتی سے دیسی پستول نکال لیا۔ اس کی کھردری بے ہنگم نال میں مٹیالے رنگ کا کارتوس لگا کر تا ناہی تھا کہ بھکا اور راج دین کی سنگت میں کوئی دو درجن لاٹھیوں نے تراب کو اپنی باڑھ پر رکھ لیا۔ تراب کی مدد کو گدی دوڑے لیکن ہزار بارہ سو پاسیوں کے سیلابی ریلے میں بہہ گئے۔ بہت سے گدی بھی مان پور والوں کی طرح ہاتھوں میں سودا سلف لیے بغل میں لاٹھی دبائے نکل آئے تھے۔ بہت ایسے بھی تھے جو زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر محض تفنن طبع کے طور پر آ نکلے تھے۔ لیکن اتنی بات سچ تھی کہ چند کو چھوڑ کر سارے کے سارے گدی ان پاسیوں کے سامنے معلق تھے جن سے ابھی چند روز قبل وہ بھینسیں چھین کر ہانک لے گئے تھے۔ مجو بھیا کے نقروں اور تیوروں پر وہ چونکے ضرور تھے۔ لیکن مان پور کی آدھی جوان آبادی کو کھڑا دیکھ کر ان کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔ آتش بازی کی چرخی کی طرح جب پاسیوں کی لاٹھیاں چومکھی مار کرنے لگیں اور مان پور والے بھیڑ لگاتے کھڑے

رہے ہیں جیسے محرّم کے اکھاڑے میں تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ تو کسی چالاک گدّی نے
نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بھاگتے ہوؤں کو جیسے کمک مل گئی۔ انھوں نے گلا پھاڑ کر ”اللہ اکبر“
کی تکرار کی۔ راج دین اور بوڑھے باڑے پاسیوں کے ہاتھ سست ہو گئے اور انھوں
نے بڑی حسرت سے جگّو بھیّا کو دیکھا۔ ان پوروالوں میں بہت سے ایسے تھے جنھوں
نے تراب کے ساتھ بانے ہلائے تھے۔ تاڑی کے گھڑ توڑے تھے۔ عورتوں کے بدن
لوٹے تھے اور مار کھاتے ہوئے تراب کو دیکھ کر تازی کتوں کی طرح زنجیر تڑانے کی فکر
میں تھے۔ دلوں میں آگ بھر دینے والی اس آواز کو سنتے ہی بے قرار ہو گئے۔ ”اللہ اکبر“
کی تکرار کرتے ہوئے لاٹھیاں سونت کر دوڑ پڑے۔ لیکن جگّو بھیا نے زمین میں گڑے
ہوئے چابک کو سر سے گھسیٹ کر بجلی کے ایڑ لگائی جو بھینچتا ہوا فجو خاں اور بخش
کی جٹیا کا راستہ روک کر پاؤں پٹخنے لگا۔ پھر فجو خاں اور بخش کے کئی جیالے ساتھیوں
نے اپنے بازو اور سینے پر کوڑے کی جلتی ہوئی چوٹ محسوس کی۔ ساتھ ہی جگو بھیّا، چھوٹے
خاں اور دوسرے بڑے بوڑھوں کی گالیوں کی بوچھار تیروں کی طرح ان کے کلیجوں
پر پڑی۔ اور وہ جہاں تھے وہیں مچل کر رہ گئے۔ اب میدان صاف ہو چکا تھا۔
پیرا۔ تراب اور تراب کے بھتیجے کی لاش چھوڑ کر سارے گدّی بھاگ نکلے۔
بھکا اور رام دین نے لاٹھی کے کوڑوں سے تراب کی لاش بگاڑی پھر آدمیوں کو
سمیٹ کر بھیکم پور پر ہلہ بول دیا۔ چیختی ہوئی عورتوں نے اپنے آپ اور دوسرے
بچوں کو اٹھا کر کوٹھریوں میں دفن کر لیا۔ یا پڑوس کے پردے پر بھاگ نکلیں۔

تراب کے اندر سے بند دروازے پر چھوٹے سے چھپر کا مُٹھا بھر پھوس نوچ کر بدھ کا
نے الیٹی سے دیا سلائی نکالی ہی تھی کہ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے پاسیوں کی کائی پھاڑ
کر مجّو بھیّا کا بجلی تراب کے چھپر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"راج دین"

"بھیّا"

"یہ کچھ نہیں ہو گا۔ تم گاؤں کی کسی مرغی تک کو بھی نہیں چھیڑو گے۔ بس۔
پچاس آدمی روک کر تراب کے گھر کا پہرہ دو۔ سونا باہر نکل گئی تو مقدمہ ہار جاؤ گے۔
میں تھانے خبر بھیجتا ہوں۔"

پھر سارے میں لال صافے پھیل گئے۔ مان پور تک میں طاعون سا چل
گیا۔ چھوٹے سے بڑے تک سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ مجّو بھیّا کے
نوکر اور مجّو بھیّا کے گھوڑے سڑکوں پر دوڑتے نظر آتے۔ اور بس۔ عشا کی اذان
ہوتے ہوتے ہردوئی کا سپرنٹنڈنٹ پولیس آگیا۔ مان پور کے مڈل اسکول میں تھانے
داروں سے گفتگو کرنے کے بعد علاقے کی سب سے بڑی بستی کے سب سے بڑے آدمی کو
طلب کیا۔ جامدانی کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامے پر لکھنؤ کا کڑھا ہوا پلّہ دیئے۔
سچے کام کے جوتے کو آہستہ آہستہ چرمراتے ہوئے دیو قامت مجّو بھیّا ہال میں داخل
ہوئے تو انگریز سپرنٹنڈنٹ نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور کرسی کی طرف اشارہ
کرکے بیٹھنے کو کہا۔ گیس کی تیز روشنی میں ان کے دہکتے چہرے پر بڈھے انگریز کی نگاہ

نہ ٹھہرتی تھی۔ انگریز کپتان کی موجودگی میں ہندو تھانے دار نے ایک سے ایک ترچھے ٹیڑھے سوال کیے۔ لیکن مجو بھیا نے اس بلوے کو ہندو مسلم فساد نہ بننے دیا۔ گدیوں نے یہ تو دیکھا ہی تھا کہ اگر مجو بھیا بیچ میں نہ آجاتے تو پاسی پورا بھکیم پور پھونک دیتے۔ ناکہ تراب کا چھپر تک کھڑا تھا۔ پھر ان کو یہ یقین تھا کہ اگر مجو بھیا کا نام درمیان میں آگیا تو مان پور سے مسلمان شہادت کا ملنا آسان نہ ہوگا۔ اس لئے گدیوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجو بھیا کا نام نکالا تھا۔ پاسیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجو بھیا کو اس کا علم تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے جواب دے رہے تھے۔ انگریز کپتان اور ہندو تھانیدار دونوں ان کی سچائی کے معترف تھے۔ مرعوب تھے۔ مجو بھیا کے گھر سے آئی ہوئی چائے کی ایک پیالی پی کر جب کپتان جیپ پر بیٹھا تو اس نے مجو بھیا سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اپنے "بجلی" پر سوار ہو کر کپتان کی جیپ کے آگے آگے چلے۔ اور ان کی موجودگی میں تراب کے گھر سے بھکا پاسی کی بیوی سونا برآمد ہوئی۔ جس کے وجود اور بیان نے نہ صرف مقدمے کی نوعیت بدل دی۔ بلکہ مجو بھیا کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ ابھی کپتان سونا کا بیان دیکھ رہا تھا کہ پٹواری لال پرشاد بھوا بھر کاغذات لے کر مجو بھیا کے پاس آگئے اور مجو بھیا نے مکھن والے پیڑ کے اندراجات کپتان پولیس کو دکھلا دیے۔ جن کو وہ اتنے غور سے دیکھ رہا تھا گویا واقعی سب کچھ سمجھ رہا ہو۔

مان پور کے مڈل اسکول میں ساری رات گیسیں جلتی رہیں۔ رتجگا ہوتا رہا صبح ہوتے ہوتے لاشیں اور سات پاسیوں کا چالان روانہ ہوگیا۔ مجو بھیّا جب گھر آئے تو بھیڑ بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اپنی اہمیت کا اندازہ کر کے مسرور ہوتے ہوئے انھوں نے مختصر جوابات عنایت کیے۔ چھوٹے خاں کی قیادت میں مجمع منتشر ہوگیا۔ وہ شیروانی اتارتے ہوئے اندر گئے تو باورچی خانے میں رجب کی اماں کے ساتھ للّی بھی چائے کے برتن درست کرنے لگی۔ للّی کے گورے گورے ہاتھوں میں چائے کی کشتی دیکھ کر ان کی تھکن پر لگا کر اڑ گئی۔ جیسے دن بھر کے تھکے بیل گڑ کی لوئی کھا کر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ للّی نے انڈوں کے چیلے کی پلیٹ اور تر تراتی ہوئی روغنی روٹیاں ان کے آگے رکھیں تو ان کے ہونٹوں کو للّی کے گالوں کی لذت یاد آگئی۔ ان کی گردن نے شانوں سے نکل کر گھر کا جائزہ لیا۔ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ باورچی خانے سے رجب کی اماں کی کھڑ پڑ کی آواز آ رہی تھی۔ مجو بھیّا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی میدے کی کلائی پکڑ لی۔

"تراب کی لاش دیکھ لی تم نے؟"

"ہاں"

اس نے اپنی کلائی چھڑا کر کہا۔

للّی نے اپنے دروازے سے دیکھا حاجی بیٹھے کھیت میں پانی لگا رہے تھے۔

نوکر ڈوں کھینچ رہا تھا۔ مرغیاں ٹاپے کے اندر کڑ کڑا رہی تھیں۔

"حاجی کھول دیتے تو ہاتھ نائیں ٹوٹ جاتے"!

بڑبڑا کر اس نے چھینکے سے روٹی کی ڈلیا اتاری۔ ایک ہاتھ سے ٹاپے کی سِل الٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اطمینان سے روٹی مل مل کر ان کو کھلاتی رہی۔ کنکھیوں سے ٹاپے کے پاس پڑے ہوئے انڈے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد منگلو کی موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ "گھما" سنائی دیئے۔ اس نے ڈلیا پھینک کر کنواری لڑکیوں کی طرح قلانچ لگائی اور دروازے کی جھریوں پر آنکھیں رکھ دیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئیں۔ لیکن وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی دروازے پر جھکی رہی۔ چندہ کا دوپٹہ زمین پر پڑا تھا۔ الجھے بالوں کی لٹیں منھ پر جھول رہی تھیں۔ آنکھوں سے بہہ کر موٹے موٹے آنسو لال لال گالوں پر چمک رہے تھے۔

"تم ہوں اُدکے بدماس کے ساتھ بکسے میں بند ھوئے کے چلی جاؤ"!

منگلو نے کٹکٹا کر کہا اور دھم دھم گھونسے مارنے لگا۔ للّی نے جھن سے زنجیر کھولی اور گڑاپ اندر چلی گئی۔

"تو کا مار ڈلبہیو تم ای کا...... چھوڑ دو"!

منگلو کے ہاتھ سے چندہ کی کلائی چھڑا کر وہ اسے لئے ہوئے اپنے گھر چلی آئی۔ پیتل کے لوٹے میں پانی بھر کر چندہ کا منھ ہاتھ دھلایا۔ پھر مرادآبادی گلاس میں گڑ کا شربت بنا کر اسے پلایا۔ للّی نے اپنے دل کی جھولی میں خوشیوں کی اشرفیوں کی ایسی

چھنچھناہٹ سنی کہ انگ انگ ناچ اٹھا "موت زندگی اللہ کے گھر سے ملتی ہے ...

... رو دھو کر اپنا آپ جلاتی ہو ..... مٹی خراب کرتی ہو "

للّی نے چھوٹے خاں کی بہو کی پیاری پیاری باتوں کی نقل کی۔ پھر چندہ کے سوکھے بالوں کی چوٹی گوندھنے لگی۔

"آج بھیّا پوچھ رہے تھے کہ تراب کی دولہن سے بھی کچھ جان پہچان رہے"۔

چندہ نے چونک کر اپنے بال چھڑا لئے۔ لال لال آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"مجّو بھیا پوچھت رہیں"

"ہاں ..... معلوم ناہیں ان کا کیسے سُن گُن مل گئی"

"تم کا کہیو"

"میں کہوں ... اللہ اللہ کرو بھیّا .... دیوار سے تو دیوار ملی ہے میرے گھر کی .... وال تک بگھاری گئی تو میں کا معلوم .... اتنا لاٹ ایسا آدمی آتا تو پردے پڑے رہتے "

"پھر"

"پھر کا .... چپ سادھ لی .... مگر ہے ان کا شک ....۔"

محرّم بھر حکام پڑے رہے۔ ان کے ناشتے کے انڈوں سے لے کر گھوڑوں کی گھاس تک مجو بھیّا کے ذکر ہوا کرتے رہے۔ تھانیدار سکینہ تو ان کا مرید ہو گیا۔

تھوڑی سی دوڑ دھوپ کر کے اس نے مجو بھیا کو بندوق کا لائسنس دلا دیا۔ اُدھر
مجو بھیا نے مقدمے کی ایسی پیروی کی کہ ایک ایک آدمی سشن سے چھوٹ گیا۔
ٹھیک ہولی کے دن مجو بھیا لکھنؤ سے دونالی بندوق خرید کر لائے۔ رات میں پاسیوں
نے مجو بھیا کے دوادے پر جشن کیا۔ رات بھر کڑاہیاں چڑھی رہیں۔ رنڈیاں
ناچتی رہیں۔ للّو نے اسی رات مسجد میں طاق بھرے اور میلاد شریف کیا۔ مجو بھیا
شامیانے کے نیچے گاؤ لگائے الوان اوڑھے سگریٹ پیتے رہے۔ ناچ دیکھتے رہے۔
وہ شرمیلے مجو بھیا جو جوان عورتوں کا راستہ چھوڑ دیتے۔ بات کرتے تو لڑکیوں کی
طرح آنکھیں نہ اٹھاتے ہزار بارہ سو پاسیوں کے دیواستھان پر بیٹھے ہوئے خرانٹ
عیاشوں کی طرح ناچ دیکھتے رہے۔ رام دین اپنے چکّی کے پاٹ ایسے سینے پر رتوسوں کا
کی میبی کا تمغہ لگائے ان کے گاؤ کے پیچھے بیٹھا رہا۔

مجو بھیا کے مکان سے گزرتی ہوئی سڑک پر تھوڑی دور چل کر بائیں طرف
مڈل اسکول تھا۔ جس کی جھنجھری دار چہار دیواری گوٹ کی طرح سڑک پر رکھی تھی۔
اس کے سامنے سڑک کے دوسری طرف اسکول کی فیلڈ تھی جسے لوگ میدان کہتے۔
یہاں بستی بھر کے چھٹّا جانور پھرا کرتے۔ لڑکے گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے۔ کبھی کبھی پتنگ
کے "میچ" بھی منعقد ہو جاتے۔ اس کے اطراف پٹھانوں، کبڑیوں، اور جلاہوں کے
ملے جلے مکان تھے کمسن لڑکی کی پکائی ہوئی روٹی کی طرح ٹیڑھی میڑھی دیواروں

پر بوڑھی عورتوں کے بالوں کی طرح متردد بے چھپر جھولا کرتے۔ بوڑھی کھوسٹ دیواروں
سے پھوٹتے سوراخوں سے سیراب ہوتے ہوئے کالے نابدان راہگیروں کی ناک پر
رومال رکھ دیتے۔ کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر یہ کالی غلاظت سودے سلف سے لدے پھندے
بوڑھے بوڑھے آدمیوں کو اسکول کے لڑکوں کی قواعد کراتی رہتی۔ عورتیں اپنی دہلیز کے
نیچے دو دو اینٹیں رکھ کر بچوں کے لئے سنڈاس بنا دیتیں۔ جس چبوترے کے چھپر میں کالو
درزی کی مشین رکھی تھی وہاں سے جلیبی جان کے گھر تک دونوں طرف دوکانیں ہی
دوکانیں ملتیں۔ جلیبی جان کے مکان کے سامنے سڑک کے داہنے طرف لمبے چوڑے
میدان میں گوریّا سے لے کر ہاتھی کی قبر کے سائز تک کے ان گنت چبوترے ملتے
جن پر دو ہفتے میں دو دن دوکان دار اپنی دوکانیں سجاتے۔ اس کے آگے سکلیوں
اور ڈھپالیوں کی بستی فقیر کی گدڑی کی طرح پڑی سوکھتی رہتی جس پر بدصورت عورتوں
اور غلیظ بچّوں کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف مڑ کر دیکھنے سے
مان پور کی مسجد کا گنبد نظر آتا۔ جس کا صحن مجو بھیّا نے وسیع کرایا تھا۔ مسجد کے پاس
ہی پرائمری اسکول کی جھکی جھکی سی عمارت دکھائی پڑتی۔ جیسے کوئی لڑکا ملگجے کپڑے
پہنے ٹاٹ پر بیٹھا نقشہ بنا رہا ہو۔ پرائمری اسکول کے سامنے آبادی ہے اور پیچھے
کھیت۔ اس کے لمبے چوڑے رقبے کو بانسیوں کا سرسبز احاطہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس
کے کمروں میں مختلف لوگ مختلف قسم کے کام کرتے۔ دن میں لڑکے پڑھتے ہیں شام
کو اگر کھیت کھلیان کا جھگڑا نہ ہوا تو "ہکّی بکورا" کھیلتے۔ نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ان

گے اندھیارے کنجوں میں "نمبردار" اور "تربھون" کی نوٹنکی میں دیکھی ہوئی لیلے مجنوں کی کہانی دہراتے۔ اغوا کی ہوئی عورتیں اس کے کمروں سے برآمد ہوئیں۔ جب چنّی لال چرسیئے اور پھجّو مل کلوار نعل نکالتے میں بے ایمانی کرنے لگتے تو مجبوراً یہاں بھی دو چار دن جوا کھیل لیا جاتا۔ یہاں سے تیر کی طرح سیدھا گلیارہ پھر سات گھروں کو پار کر کے چھوٹے خاں کے پاس ٹھٹھک جاتا۔ چھوٹے میاں کے چبوترے سے ملے لمبے چھپر میں ان پور کا مکتب تھا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو نابینا مولوی صاحب قرآن مجید پڑھانے کے بہانے دن بھر بیٹھے اونگھا کرتے اور محلے سے آئی ہوئی روکھی سوکھی روٹی کھا کر جانوروں کی طرح ڈکارتے رہتے اور اس خدا کا شکر ادا کرتے جس نے ان کو مولوی صاحب بنا دیا۔ چھپر کے سامنے پختہ کنواں تھا جس کی جگت سے لگا ہوا حوض ڈھلتی ہوئی پنڈلیوں اور کلائیوں سے جگمگایا کرتا۔ یہ کنواں محلے کے بنجر علاقے میں سرسبز نخلستان کی طرح قہقہوں سے کھنکتا رہتا۔ سرگوشیوں سے گنگنایا کرتا۔ بفاتی جلاہے کی لڑکی گھڑے سے چلو میں پانی لے کر منہ دھو رہی تھی کہ فجو خاں نے اپنے بروٹھے کی آڑ سے کنکری ماری اس نے بھیگی ہوئی آنکھیں سکیڑ کر پہلے فجو خاں کی جھانکتی ہوئی دھوتی دیکھی پھر اردگرد کا مطالعہ کر کے اطمینان سے منہ دھونے لگی — فجو خاں اس بروٹھے میں کھڑے رہے جس کے ایک کونے میں بکری کے کھونٹے کے پاس مینگنیاں پڑی سلگ رہی تھیں۔ جیسے عودان میں عود مہکتا ہوا۔ پھر فجّو خاں آہستہ سے دروازہ کھول کر باورچی خانے میں بوڑھی اماں کو جھڑے کا آٹا گوندھتے ہوئے

دیکھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ بانس کی ڈھکن دار ڈلیا میں کتھے چونے میں لت پت مٹی کی کلھیاں رکھی تھیں۔ انھوں نے ان کو نکال کر نیچے کا پرت دیکھا لیکن ایک بھی پیسہ نہ پا کر پلنگ کے نیچے سے ٹین کا صندوق گھسیٹ لیا۔ ڈھکنا ان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ پیچھے سے ان کی دولہن کلثوم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اللہ قسم ایک پیسہ نہیں ہے اس میں۔"

فجو خاں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا!

"تو دیکھ لینے دو...... پریشانی کاہے کی ہے۔"

بکس میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ لپٹ گئی۔ فجو خاں نے اسے کمر سے اٹھا کر اتنے زور سے چارپائی پر دے مارا کہ وہ چیخ پڑی۔ چیخ کی آواز سن کر چھوٹے خاں نے ہانک لگائی۔

"فجو..... ابے اے فجو۔"

فجو نے باپ کی آواز جو سنی تو کلثوم کے کالے کالے گالوں کو ہاتھ میں لے کر مکار آنکھوں سے خوشامد کرنے لگا۔

"سنا نہیں تو نے۔"

جلدی سے باہر نکل کر چوروں کی طرح وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اسکول چھوڑا..... کھیت کھلیان چھوڑا..... اب بھیا کے یہاں اٹھنا بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ گھر میں کوئی خزانہ گڑا ہے کہ میں کھود کھود کر دوزخ بھرتا رہوں۔

دس مرتبہ کہا کہ بھیا سے کہہ کر ہزار کا ٹھیکہ لے لے۔"

"نیلام کے دن تو آویں ..... کہ ٹھیکہ کوئی کھٹیا ہے ..... جب جی چاہے لے آؤں۔"

"سنتی ہو تم فجّو کی ماں ..... باتیں دیکھو سالا کیسا بارہ ہزار کی کرتا ہے۔"

چھوٹے خاں تقریر رٹ چکے تھے ابھی انھوں نے ابتدا ہی کی تھی مگر فجّو خاں بروٹھے میں غڑاپ سے الوپ ہو گیا۔ کنویں کی جگت خالی پا کر وہ آگے بڑھ گیا۔ بشیر اپنے بھائی کی پرچون کی دوکان پر بیٹھ کر پڑیاں باندھتے شعر کہتے اور کوئی خوش ذوق گاہک آجاتا تو گنگنا کر آنکھیں سینک لیتے۔ جلیبی جان کے چبوترے کے ایک مونڈھے پر بشیر کا نام لکھا تھا۔ فجّو خاں نے پہلے سوچا کہ بشیر سے کہیں پھر خیال آیا کہ یہ خود ہی ایک آدھ بیڑی کے بنڈل پر دن بھر پڑیاں لپیٹا کرتا ہے۔ اس کے پاس کیا ہوگا۔ نور علی اپنے بساطے کی چادر پر بیٹھے طلسم ہوشربا کے انداز میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ سامعین انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے سن رہے تھے۔ جیسے تراویح سنی جا رہی ہو۔ دوکان کے نیچے تین ٹانگ کے تخت پر میلے کچیلے اُٹنگے پاجامے اور تہبند برسوں کے پرانے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ منّور نے پتہ پھینک کر صدا دی۔

"اینٹ کی بیگم حکم کے یکّے پر چلی گئی خاں صاحب۔"

فجّو خاں نے مسکرا کر اس کا جواب دیا اور کھیسیں نکالے ہوئے چمرودھے جوتے کو گھسیٹتا بڑھ گیا۔ چنی لال چرپئے کے چھپّر میں بیٹھا منگو کوڑیاں ہلا رہا تھا۔ اس نے فجّو خاں کو

دیکھ کر سلام کیا اور کوڑیاں پھینک دیں۔ مگر فجّو خاں اڑے چلے گئے۔ منگلو قصائی کے دروازے پر بھرجی کا کالا کالا لڑکا بنتیں کی تھالی میں چنے کی دال کی پٹّی لئے کھڑا تھا۔ چندہ کرتے کا دامن اپنے ٹھوڑی کے نیچے دبائے شلوار کے ازار بند میں بندھے ہوئے پیسوں کی گرہ کھول رہی تھی۔ فجو خاں کی نظر اس کے پیٹ پر جم گئی۔ پھر کوڑیوں کا طواف کرتی ہوئی للّی کے آنگن میں داخل ہوگئی۔

"کا چلے آویں...... چچی"

"آؤ..... آؤ"

للّی نے روٹی کو توے پر ڈال کر اپنے گھٹنے ہنگے میں چھپالئے۔ گھائیں کی ردی کو گھماتے ہوئے بولی۔

"کیسے آئے گیوا تنے دخت"

للّی کے لہجے کی ٹھنڈک سے وہ کھٹک گیا۔ لیکن ہونٹوں پر آئی ہوئی اگل ہی دی۔

"آج ایک اٹھنی دے دیو...... کل بارہ آنے لے لیو"

"کا ہمنی پیرے مانگن ہیں"

رہیے سمجھ لیو"

"پیسے تو بھائی اتنے دخت ہیں نائیں..... کہو تو ترکیب ایک بتائے دیں"

"بتاؤ" وہ بہت دور سے بولا۔

"چندہ کل ایک گنی بھنائن ہیں"
"گنی۔۔۔۔ اور چندہ"
"ارے ہاں۔۔۔ تو آب کے دی ہوئے ایک آدھ پڑی"
"ہوں۔۔۔۔ تبھی منگو چنی لال جمپئے کے یہاں بیٹھے تھے۔۔۔۔ میں کہوں کہ ملینڈ کی کو زکام کب سے ہوا"
"اینٹھ لیو دو ایک روپیہ تم ہو"
"ہے اتنے وقت اکیلی"
"اتنے وخت روٹی پانی کے وخت کون سگا بیٹھا ہو ہے۔۔۔ منگو ہوئے تو ہوئے"
"منگلو تو کوڑی پھینک رہے ہیں۔۔۔۔ ادھر سے چلے جائیں"
"چلے جاؤ"
فجّو خاں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ چھپر میں چارپائی پر بیٹھی چندہ بِڑی کھا رہی تھی۔ چونک کر کھڑی ہوگئی، سرہانے سے چادر اٹھا کر اوڑھنے لگی۔
"مجّو بھیّا نے بھیجا ہے تم سے بات کرنے کو۔۔۔ دروازہ بند ہے باہری"
فجو خاں نے کھنکار کر کہا اور اس کے بھاری بدن کے نشیب و فراز گھورنے لگا۔ وہ جب کھڑی رہی تو فجّو خاں نے خود بھاگ کر اپنا اطمینان کر لیا۔ اور اس کے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے اور بڑے متفکرانہ انداز میں بولے۔

"ترآب نے ایک گدی سے کہا تھا کہ پستول تمہارے پاس ہے... اب وہ گدی بھیا کے پاس آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر چندہ نے پستول نہ دیا تو پولیس کو خبر کر دی جائے گی۔ پولیس خود برآمد کر لے گی۔"

"چاہے جیسی قسم لے لیو...... میں نائیں جانت ہوں پستول۔"

"دیکھو پولیس کو پہلے ہی سے سن گن ہے مگر بھیا نے پاؤں نہ ٹیکا کیونکہ تم اگر پولیس کے ہاتھ پڑ جاتیں تو معلوم نہیں کیا حشر ہو گیا ہوتا تمہارا اس لئے۔"

"ترآب نے گنی بھی نہیں چھوڑیں۔"

"گنی۔"

"ہاں ہاں گنی... جب کل بھن کر آئی ہیں ہردوئی سے تب ہی کہہ رہا ہوں آج۔"

اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ فتو خاں نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ لیا اور گردن کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیسے بنیا گولک ٹٹولتا ہے۔

جلیبی جان کی صورت تو ایسی تھی جیسے بھینس کی ران پر چاقو سے آنکھیں گود دی جائیں۔ ناک کی لکیر کھینچ کر دو نقطے رکھ دیئے جائیں۔ مگر خدا نے گلا ایسا نور کا دیا تھا کہ بڑی بڑی اکھاڑے دار طوائفیں بے سری ہو جاتیں۔ ماں پور کے جوانوں کو پنڈت درگا سہائے کی شادی یاد تھی۔ گگرادال کی کوٹھی کے سامنے شامیانے میں لکھنؤ اور

فیض آباد کی طوائفوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جب جلیبی جان اپنے سازندوں کے ساتھ پہنچیں تو محفل تو خیر محفل تھی۔ طوائفیں تک منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جلیبی کسی بدصورت ہیجڑے نے پیشواز پہن لی ہو۔ طبلے پر رام دلارے کی تھاپ پڑتے ہی جلیبی جان نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر جو تان لگائی تو محفل سانس پینے لگی۔ ساز رو دینے لگے۔ جلیبی جان نے بیٹھے بیٹھے بدنصیب انشا کی وہ غزل چھیڑ دی جس میں اس کے نصیب کی ساری کارفرمائی دھڑک اٹھی ہے۔

"نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی"

تو بوڑھے بوڑھے رئیس جن کے سینوں میں فارسی کے دیوان دفن تھے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے اور دوسرے ہاتھ سے جیبیں خالی کرنے لگے۔ رلا مو کے جواہر سنگھ کے پاس جب کچھ نہ رہا تو کانوں کے دُر اتار کر پھینک دیئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جلیبی جان اور ان کے سازندے برسوں اس مجرے کی روٹی کھاتے رہے۔ منی جان کے جوان ہوتے ہی جلیبی جان نے گھنگرو اتار کر اس کو پہنا دیئے اور آپ چولھا پھونکنے لگیں۔ منی جان اور نھنی جان دونوں بے سُری تھیں۔ گانا ان کے پیشے کا بہانہ تھا۔ صورت شکل میں بھلا آدمی کا بچہ تھیں مگر جوان تھیں۔ جوانی اور رنڈی کی جوانی۔ مان پور کے سارے بے فکرے چونی اٹھنی کا بندوبست کر کے رنگی چنگی ٹھرکا کا ایسی گول مٹول طوائفوں میں بیٹھ کر ذرا ہنس بول لیتے۔ نجو خاں اور ملکس مان پور کے دوسرے ہنگاموں کی طرح یہاں بھی پیش پیش رہتے۔ چندہ سے چاندی

کے جھنجھناتے ہوئے چار روپے لے کر نجّو خاں سیدھے بخش کے یہاں پہنچے۔ اور اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنی جیب پر رکھ لیا۔ بخش نے یہ خزانہ جو دیکھا تو جلدی جلدی ہاتھ پاؤں دھو کر جامدانی کی قمیص میں چاندی کے زنجیر دار بٹن لگائے اور لاٹھی لے کر نجّو خاں کے ساتھ ہو لیا۔ جلیبی جان کی چھوٹی بیٹی ننھی جان پر صدقے ہو کر جب یہ لوگ باہر نکل آئے تو نجّو خاں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر خالص مہاجنی انداز میں بجایا۔ روپے کی شیریں کپکپاتی آواز کی طرح بخش کے اعصاب بھی جھنجھنا اٹھے وہ اب تک سوچ رہا تھا کہ آخر نجّو خاں کو چار روپے ملے کہاں سے۔

"یار بکس اگر تقدیر سے یاری ہو جائے تو ایک کے چار بن سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور کل پھر۔"

"یار نجّو بھیا کے کھیت میں آلو بو کر تو ہم بھر پائے جب دیکھو بپّا بھٹینا دیا کرت ہیں کہ جون ہاتھن سے بھیّا کے کھیت سے سونا نکالے ہو انھیں ہاتھوں سے اپنے یہاں کچھ کر کے دکھاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یو بہانہ لے کے بڑی بہنے کا بھی ٹھکانا ئیں دیت ہیں، لے دے کے ایک ٹھکانہ بھیا کا رہ گوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ باقی تو سب خیر صلّا ہے۔"

"یار کہیں سے ایک روپیہ لاؤ۔ ۔ ۔ تو چار بازی کھیل لی جائے۔"

"بھیّا سن پائے تو کھال اتار ڈالی جیہے۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"اچھا آج چھوڑ دو۔ ۔ ۔ شاید کل تک کوئی بندوبست ہو ئے جائے۔"

دوسرے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی طرح تراب کا نام بھی چٹخارے دار کہانی کہنے والوں کی زبان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن چندہ کے نام کو پر لگ گئے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر گائے کے گوشت کی جھوئی سر پر رکھ کر جب وہ گھروں میں جاتی تو نگاہیں چونک چونک کر اس کے جسم کے خطوط میں وہ کہانی ڈھونڈنے لگتیں جس پر جوار کے سب سے نامی آدمی کا نام لکھا تھا۔ منگلو بچھڑے کی روٹی اور اوجھڑی کا سالن دے کر اس کی گداز پیٹھ پر اتنے گھونسے مارتا کہ اس کے پیٹ میں سانس نہ سماتی۔ یہ تو وہ جھیل ہی رہی تھی لیکن فجو خاں کے بکوٹوں کی ٹیس سے وہ بے قرار ہو گئی۔ بیچ کی دیوار پھاند کر جب للّی کی آواز اس کے آنگن میں آ کر کدکڑے لگاتی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ اسی حرّافہ نے بھیّا سے پستول والی بات داغی ہے۔ اسی بدمعاش نے فجو خاں کو گنّی کی چھنا چھن سنائی ہے۔ منگلو دکان بڑھا کر آیا تو اس نے کھال میں نمک بھر کر رکھ دیا اور چھوٹی سے بھیجے اور گردے نکال کر نئی بنی ہوئی ڈلیا میں رکھتے وقت اس نے طے کر لیا کہ اگر جوتے ہی کھانا ہیں تو فجو خاں اور پولیس کے سپاہیوں کے کیوں کھائے جائیں۔ بھیّا کے کھا لیے جائیں جن کی ایڑی کے نیچے للّی کی چٹیا بھی دھری ہے۔

اساڑھ بھرنے لگا تھا۔ مگر پوس کی طرح آسمان ننگا پڑا تھا۔ بادلوں کے بیر

موسم کے پٹارے میں تہہ کیے رکھے تھے۔ سفید دیواروں سے گھرے ہوئے صحن میں دو سیدھے شہتیروں پر ایک آڑا شہتیر جڑا ہوا تھا جیسے فٹ بال کی فیلڈ سے ایک "گول" اکھاڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آڑے شہتیر سے لمبا سا پنکھا جھول رہا تھا۔ مجوّ بھیا کی مسہری کے نیچے پڑے ہوئے جوتوں سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر آدمی بھر اونچا اسٹول رکھا تھا۔ اس پر ایک چمار کارٹ کا مشین کی طرح نصب پنکھے کی ڈوری لیے جھوم رہا تھا مگر مجوّ بھیا کروٹیں بدلے جا رہے تھے۔ بے آب و گیاہ میدان میں سبزے کی جستجو کرتے آہو کی مانند نیند معلوم نہیں کتنی دور نکل گئی تھی۔ مجوّ بھیا ایک ایک خواب ایک ایک خیال دل کے نہاں خانے سے نکال لائے۔ لیکن جلتی ہوئی پلکوں میں صلح نہ ہوئی۔ پھر مرغ بولنے لگے۔۔ اذانیں ہونے لگیں۔ استاد مدّی آ گئے۔ اکھاڑے میں پٹھے زور کرنے لگے۔ نوکر اصطبل میں جھاڑو دینے لگے۔ سائیس گھوڑوں کے کھریرہ کرنے لگے۔ لیکن مجو بھیا سینبھل کی روئی کے تکیوں پر سر رگڑتے رہے۔ پھر استاد مدّی نے کنکھیوں سے مجو بھیا کی مسہری دیکھ کر پورن کو نیم کی مسواک توڑنے کا اشارہ کیا۔ پورن نے لاٹھی سے مار کر مسواک توڑی۔ لنگوٹ پر لگے ہوئے چاقو سے اُسے صاف کیا اپنے بنائے ہوئے بدن پر انگوچھا ڈال کر مجو بھیا کے پائینتی کھڑا ہو گیا کچھ دیر کے بعد مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر مسواک لے لی۔

پورن مڑ گیا۔ مجوّ بھیا مسواک کو دانتوں میں دبا کر اٹھے۔ تہبند کی گرہ درست کرتے ہوئے۔ دوسرے مکان کے اس بڑے سے کمرے میں گھس گئے جو غسل

خانے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ منّواں پاسی نے شیخ مرحوم کے وقت کا سوٹ کیس
کھول کر چوڑی دار پاجامہ اور کڑھا ہوا کرتا نکالا۔ ازار بند ڈالنے کے لئے
بھانگمہ کی لکڑی کو صاف کرنے لگا۔ شیروانی میں چاندی کے بٹن لگا کر گردین نے
ناشتے کے تیار ہونے کی اطلاع دی لیکن بھیّا نے نفی میں سر ہلا کر رام دین کے ہاتھ
سے جوتا لے لیا جو بڑی دیر سے اپنے انگوچھے سے چمکا رہا تھا۔ رام دین اپنے کندھے
سے بندوق لگائے کنپٹی پر بہتا ہوا تیل انگلیوں سے پونچھ رہا تھا۔ بھیا کو آتا دیکھ
کر اس نے بندوق کے فیتے کو گردن میں پہن لیا۔ بجلی کو چمکتی ہوئی کاٹھی پہنا کر سائیس
لے آیا۔ جے جے نے لپک کر ایک رکاب پکڑ لی اور مجو بھیا سوار ہو گئے۔ مان پور
سے گنگراواں کی کوٹھی تک ان گنت سلاموں کو سر کی جنبش سے قبول کرتے ہوئے مجّو
بھیا نے پورٹیکو میں سینے تک لگام کھینچ کر بجلی کو روکا۔ جب تک رام دین اپنے
گھوڑے سے اترے۔ گنگراواں کے سپاہی نے جھل مل دکھلاتے ہوئے بجلی کی لگام
پکڑ لی۔ مجّو بھیا اس کی گردن تھپتھپا کر اتر آئے۔ کسی خدمت گار نے لپک کر چق اٹھا
دی۔ پنڈت درگا سہائے بھاری تخت کی مسند پر گاؤ لگائے چاندی کی گڑگڑی
پی رہے تھے۔ جھاگ ایسی سفید دھوتی ان کے گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ گردن
کی سنہری زنجیر ان کے ننگے پیٹ کے رقبے کو چھو رہی تھی۔ مجّو بھیا کے سلام کا مسکرا
کر جواب دیا اور اپنے پاس ہی تخت پر بٹھا لیا۔ خدمت گار پائیدان پر جوتے اتار کر
قالین پر پورے قدم رکھتا آیا اور مجّو بھیا کی پشت پر کھڑے ہو کر پنکھا ہلانے لگا۔

چھت گیری سے طلوع ہوتے ہوئے فانوس کے نقش و نگار دیکھتے ہوئے مجّو بھیّا کو درگا سہائے نے مسکرا کر دیکھا۔

"کیسے نکل پڑے صبح صبح"۔

"آپ ہی کے پاس آیا ہوں"۔

"ٹھنڈائی نہیں آئی؟"

درگا سہائے نے خدمت گار کو دیکھ کر جھڑکی دی۔

"آئی رہی ہے"۔

اس نے آہستہ سے کہا اور پنکھا تیز کر دیا۔

"تحصیل جا رہے تھے"۔

"جی.... نہیں.... سنا تھا کوئی جودھپور سے گھوڑا منگوایا ہے آپ نے"۔

درگا سہائے نے پہلو بدل کر تبختر سے گردن ہلائی۔

"منگوایا ہے"۔

"ایسی دھوم مچی ہے علاقے میں کہ سُن سُن کر نیند اڑ گئی"۔

پنڈت کی پشت کے دروازے کا پردہ ہٹا کر ایک کالا کالا لڑکا ہاتھوں میں کڑے پہنے آیا اور دو پلیٹوں میں پکوان اور دو گلاسوں میں ٹھنڈائی تخت پر رکھ کر تھالی ہلاتا چلا گیا۔ درگا سہائے نے ایک پلیٹ اور ایک گلاس مجّو بھیا کے سامنے کر کے ٹھنڈائی کا ایک گھونٹ لیا۔

"تو گھوڑا دیکھنے آئے ہو تم۔۔۔ میں کہوں کہ دن میں چاند کیسے نکل آیا۔۔
۔۔۔۔کسی سے کہو گھوڑا نکالے۔"
آدمی مجسم تسلیم ہوکر پنکھا صوفے پر رکھتا ہوا چلا گیا۔
پھر پورٹیکو کے فرش پر ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ تجو بھیا اپنی بے قراری چھپائے بغیر گلاس رکھ کر اٹھ پڑے۔ سپاہیوں کے ہجوم میں گھوڑا کھڑا تھا۔ سفید گھوڑا ۔۔۔۔ تصویروں کا گھوڑا۔۔۔۔ کہانیوں کا گھوڑا۔۔۔۔ خوابوں کا گھوڑا۔۔۔۔
جب وہ ہنہنا کر گردن اٹھاتا تو معلوم ہوتا طاؤس ناچ رہا ہے۔ لمبی گردن کہ سوار کو چھپا لے۔ تجو بھیا خوابناک آنکھوں سے اس کی شان دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ بجو درگا سہائے تجو بھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے۔ مغرور مسکراہٹ جیسے شکاری اپنے شکار کو پھنستا ہوا دیکھ کر مسکرائے۔
"دہانہ دیکھ رہے ہو تجو۔۔۔۔ چائے کی پیالی میں پانی دے دو تو پی جائے"
"گھوڑا نہیں ہے پنڈت جی۔۔۔۔ پری ہے"
"ہوں۔۔۔۔ تو پسند آیا۔۔۔ اڑا پاؤ تو اڑا کر دیکھو"
"ضرور اڑاؤں گا۔۔۔ ضرور اڑاؤں گا"
ایک سپاہی نے لگام بڑھا دی۔ دوسرے نے رکاب تھام لی۔ تجو بھیا کو لے کر گھوڑا بجلی کی طرح نکل گیا۔ درگا سہائے گاؤ سے پشت لگائے گڑگڑی پیتے رہے۔ فرش کے قالین کے پھول چنتے رہے جب تجو بھیا اندر آ گئے تب انھوں

نے نگاہ اٹھائی۔

"چال میں کیسا ہے"

"جادو۔۔۔۔ٹونا"

تجو بھیّا کی شیروانی پسینے ڈوبی ہوئی تھی۔ خدمت گاران کی پشت پر کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ آرام کرسی پر دراز تھے۔

"آیا کتنے میں یہ پنڈت جی"

مجو بھیا نے بڑی حسرت سے اس کا منہ دیکھ کر پوچھا۔

"گھڑی بھر روپے میں"

بڑی تمکنت سے پنڈت جی نے یہ الفاظ ادا کیے۔ پھر دانتوں میں چہنال دبالی۔

"پھر بھی کچھ تعداد بھی تو ہوگی"

تجو بھیا گڑگڑائے۔

دیر کے بعد پنڈت جی نے چہنال نکالی۔ اٹھ کر بیٹھے۔ منہ پر آئے ہوئے جلے کی دھار دیکھی اور مسکرائے۔

"پٹواری کے کاغذات میں جو تمھاری جائیداد ہے نا اس سے زیادہ ہی تعداد ۔۔۔۔بتیس سو روپیہ پورے بتیس سو"

مجو بھیّا پر جیسے گڑگڑی کا انگارہ اچھل کر گر پڑا ہو۔ ان کی دونوں بھوئیں

اچک کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ رنگ اڑ گیا۔

"ایک فصل میں ایک کھیت کا لہسن بتیس سو کا بیچتا ہوں۔ پنڈت جی۔"

کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا کر ڈوب گئی۔

"ہوں.... کلو امراؤ چونسٹھ سو کا بیچتا ہے۔"

منجو بھیا کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خدمت گار نے پنکھا روک لیا۔

"تو کلو امراؤ سے جوڑ ملایا ہے آپ نے میرا۔"

"نہیں..... وہ میری رعایا کا بیٹا ہے اور تم نوکو کے۔"

پنڈت جی کے لہجے میں وہی ٹھنڈک تھی۔ وہی زہر تھا۔

"دیکھا جائے گا پنڈت جی۔"

منجو بھیا دروازے کی طرف مڑ گئے۔ باہر نکلتے نکلتے انھوں نے سنا۔

"توپ لگوا دینا..... نو دولتا کہیں کا۔"

رام دین کو شہسواری کے جتنے کرتب یاد تھے ان سب کا اس نے آموختہ پڑھ لیا۔ لیکن بجلی کی گرد بھی نہ ملی۔ جب وہ مکان پہنچا تو سائیس اس کو ٹہلا رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا لگا کر اٹھا لیا گیا۔ رات کا کھانا لگا کر اٹھا لیا گیا۔ عشا کی نماز کے بعد بھیا کمرے سے نکلے۔ پنکھے کے نیچے لگی ہوئی مسہری پر لیٹتے ہوئے نگاہ کی۔ سارے نوکر قطار باندھے کھڑے تھے۔

"جاؤ تم لوگ"

سب بے آواز قدموں سے سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔

پھر صبح ہوئی۔ للّی چمکتی ہوئی آئی ــــ لیکن کمرے کے بند دروازے پر بیٹھے ہوئے پاسی نے کہہ دیا کہ بھیّا کا حکم ہے کہ کوئی نہ آنے پاوے۔ وہ چلی گئی۔ دوپہر کو بوڑھا راج دین پتا ور ایسی مونچھیں چڑھائے ہوئے آیا۔ دالان میں بلّم کھڑا کر دیا۔ جوتے اتارے۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر ان کی مسہری پائینتی بیٹھ گیا۔ مگر نگاہ نہ اٹھی۔ وہ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

مغرب کی نماز کے وقت جب گردین نے لیمپ جلا کر رکھا۔ دروازے کھول دیے تو اس کو اور پنکھا کھینچتے ہوئے رام رتن دونوں کو راج دین نے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ کھسک کر مسہری کے تکیے کے پاس آگیا۔

"حکم ہو...... تو نگراواں کا گھوڑا کھول کر گڑھی کے تھان پر باندھ دیا جائے"

"گھوڑا چاندی کا نہیں ہوتا جسے سنار گلا کر دوسرا بنا دے اور پتہ نہ چلے کہ یہ مان پور کا ہے یا نگراواں کا"

"اس کا بھی بندوبست ہے مالک"

"کیا"

"حاجی بیٹے"

"ہوں"

بڑی دیر تک سناٹا رہا۔ پھر بڑی دیر تک راج دین سرگوشیاں کرتا رہا۔

عشا کی اذان کے وقت وہ باہر نکلا اور کسی نوکر کو حکم دیا کہ للّی کو ساتھ لے کر آئے۔

پھر جب بھیّا راج دین اور للّی کمرے کے باہر نکلے تو پہرہ پڑنے لگا تھا—— دو نوکر للّی کو پہنچنے گئے۔

منگلو کی دھوتی میں بندھے کپڑوں کی گٹھڑی رکھ کر جب دھوبن چلی گئی تو چندہ نے وہ شلوار نکالی جس کے پائنچے پر ہرے پھول کڑھے تھے۔ وہ قمیص نکالی جس کے دامن پر لال لال گلدستے تھے۔ پھر بالو سے صاف کئے ہوئے بتانے طوق اور جھانجھیں پہن کر وہ کپڑے لیے کوٹھری میں چلی گئی۔ چھپر کے طاق میں دھرے ہوئے ٹین کے آئینے میں آنکھوں کا کاجل برابر کیا۔ مانجھے ہوئے طباق میں گردے اور بھیجا رکھ کر تانبے کی رکابی بند کی۔ اور گھر میں تالا ڈال دیا۔ چھنک چھنک کی آواز سن کر رجب کی اماں نے چپاتی پکاتے ہوئے ہاتھ روک لیے۔

"منگلو کی دولہن . . . . آؤ"

"کا بوبو . . . . بھیّا ہیں"

"ہاں"

رجب کی اماں نے آٹے میں ڈوبی ہوئی لوہے کی پھکنی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ طباق آٹے کی لگن کے پاس رکھ کر دھڑ دھڑ کرتے ہوئے کلیجے

کو سنبھالے رک گئی۔ پھر من من بھر کے پاؤں اٹھاتی دالان کی طرف چلی۔ مجو بھیا کھیت سے آئے تھے۔ چوڑی دار پائجامہ اتار کر تہبند پہن چکے تھے۔ کرتا اتارتے ہوئے دیکھا۔ تو دالان کے در میں چندہ کھڑی شرما رہی تھی۔

"کیا ہے؟"

انھوں نے اپنی روایتی گرجدار آواز میں تو کہہ دیا۔ لیکن ذہن کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تراب کی معشوقہ کے جسم کی آن دیکھنے کی حسرت نے ان کو ڈس لیا۔

جب وہ کمرے کی دہلیز پر آگئی تو مجّو بھیا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"چلی آؤ"

تراب کی موت کے بعد ان گنت نگاہوں کے عرفان کی دولت سے چندہ نے اس تھرتھراتی ہوئی آواز میں چھپے ہوئے معنی دیکھ لئے۔ مجّو بھیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تراب سے نکلے ہوئے قد کے تراب سے کہیں تندرست اور وجیہہ مجو بھیا، دیو کی طرح تخت پر بیٹھے تھے ان کے پاؤں کچے فرش پر رکھے تھے۔ چندہ نے ہارتے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤں چلا اور اپنا سر مجو بھیاؔ کے موٹے موٹے پیروں پر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔

"ارے ارے"

مجّو بھیا نے گھبرا کر اس کا سر اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ تو وہ پھسل کر چندہ کے گالوں پر آگئے۔ سر اٹھا تو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں سے کاجل پھیل گیا تھا۔

چہرہ دمک اٹھا تھا۔ سینے کے فراز پر طلائی طوق رکھا تھا۔ سرخی مائل کلائیاں ان کے گھٹنے پر تھیں۔

"منہ سے بولو۔۔۔۔ کیا ہوا؟"

"مورے پاس پستول نائیں ہے تراب کا۔ دولت نائیں ہے تراب کی۔

۔۔۔۔ بس تراب کی بدنامی میرے سر پر ہے۔"

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

"تم میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔۔۔۔ مگر پولیس تھانے نہ بھیجو۔۔۔ للّی کا تو میں سے عداوت ہے۔ اگر تراب ان کا موری کوٹھری میں اٹھائے لے گئے تو میں کیسے بچائے لیتوں۔۔۔۔ ہاں میں نائکہ بنی ہوں تو مجرم۔۔۔۔ ایک دن مورے پاس آئیں کہ دوا کے لئے تین روپے دے دیو۔"

"دوا کے لیے۔۔۔ کاہے کی دوا؟"

"وہی جو او کا مرض ہے۔۔۔۔ کوڑھ!"

"مرض تو نہیں ہے اس کو اب!"

"بھیا ہر تیسرے دن جب محلہ بھر سو چکتا ہے تو دوا بنت ہے۔۔ تو میں ان کا روپے دے دیوں۔۔۔۔ اب اس دن سے مورے پاس تراب کی گنّی جمع ہیں۔۔۔ ایک گنی میں بھنائے ضرور ہوں۔۔۔ میرے مائے کی ہیں میرے پاس۔۔۔ منگلو سے چرائی ہیں۔ منگلو سے نہ چراؤں تو جوئے میں ہار نہ جائیں۔"

"چندہ کی کلائیاں گھٹنے پر رکھی رہیں۔"

چندہ کے جانے کے بعد مجّو بھیّا جو للّی کے دسترخوان سے سیر ہو چکے تھے۔ للّی کے تصوّر سے مکدر ہو گئے۔ ان کے کان میں کسی نے کہا کہ چندہ صحیح کہتی ہے۔ للّی کا مرض گیا نہیں ہے۔ یہ مرض جاتا ہی نہیں ہے اور یہ مرض اڑ کر لگتا ہے مجّو بھیا ..... اڑ کر لگتا ہے .... اور کیا .... پھر .... تم .... اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کھانا ٹھنڈا ہوئے رہا ہے۔"

رجب کی اماں نے گلاس میں پانی بھر کے کہا۔ مجّو بھیّا دسترخوان پر بیٹھ تو گئے لیکن کھانا نہ کھایا گیا۔ کتنی جھوٹی ہے یہ للّی۔ کہتی تھی اس کو مرض کبھی تھا ہی نہیں۔ قادر بھی یہی کہتے تھے۔ حاجی میٹھے بھی یہی کہتے تھے۔ وہ تو ٹھیک ہے ان سب کو یہی کہنا چاہیے۔ وہ یہ سوچتے رہے پھر اٹھ کر باہر گئے۔ نوکر کو بلا کر راج دین کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور اسے تاکید کی کہ دوا جلد از جلد حاصل کر لی جائے۔ اور راج دین سیدھا للّی کے یہاں پہنچ گیا۔

ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ دالان میں کھانا لگ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں جلتی ہوئی ڈبیا کی روشنی میں مجو بھیا نے دیکھا کہ للّی آنچل میں چھپائے کوئی چیز لئے آ رہی ہے۔ وہ کمرے میں کھڑے رہے۔ للّی نے باورچی خانے کی دہلیز ہی پر ایک سینی میں اپنی گود خالی کی۔ اور کمرے میں چلی آئی۔ دالان میں جلتی ہوئی لالٹین

کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ للّی کے آتے ہی کمرہ جگمگا اٹھا۔ عہدِ فراموشی کا گریزاں دامن مجّو بھیّا کے ہاتھ سے نکل گیا۔ للّی کے بدن سے ان کے دونوں بازو بھر گئے۔ ڈیوڑھی میں للّی کے غروب ہو جانے کے بعد جب مجّو بھیّا نے گوشت کے پیالے میں نوالہ ڈبویا تو رجب کی اماں نے ایک چینی کی پلیٹ ان کے آگے بڑھا دی ــــ

"للّی برے لائی رہتیا"

چینی کی سرمئی پلیٹ میں دہی میں ڈوبے سفید سفید برے رکھے تھے۔ مجّو بھیّا کا ہاتھ ان پر منڈلا کر رہ گیا۔ ان کو معلوم ہوا جیسے کسی سانولی لڑکی کے بدن پر برص کے دھبے پڑے ہوں ــــ انھوں نے پلیٹ سامنے سے ہٹا دی۔ ذہن سے اس گھناؤنے تصور کو جھٹک کر انھوں نے بڑے خلوص سے نوالہ منہ میں رکھا مگر منہ کا مزہ بدمزہ ہو چکا تھا۔

ککراواں کی کوٹھی کا پہرے دار گلے میں بندوق پہنے ٹہلتا رہا اور آنکھ سے کاجل اڑا لے جانے والے فنکار گھوڑا نکال لے گئے۔ جے پور کے کٹھار میں چمار کی رانی سے راج دین نے وہ بال اتار لیے جن پر درگا سہائے آف ککراواں کی مغرور انگلیاں مشاطگی کرتی تھیں۔ رام دین اور دلارے نے بیلوں کی سینگ رنگنے والی سیاہی

سے "نقرہ" جانور کو "ابلق" بنا دیا۔ راج دین اس پر چڑھ کر رانی داتا دھنک پور اپنی بڑی بیٹی کی سسرال پہنچا۔ وہاں "ابلق" کو "مشکی" بنا کر داماد کو سوار کرایا اور خود دس بارہ لٹھ بند لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ضلع ہردوئی کے رام نگر میں اتر پڑا۔ رام نگر کے مکھیا۔ پاسیوں کی ناک اور اپنے سمدھی کے سامنے حاجی بیٹھے کی دواؤں کے پشتارے کے ساتھ ساری کہانی بھی رکھ دی۔ ترکیب استعمال کا نسخہ سمجھا کر آندھی کی طرح۔ چودہ آیا اور حالات کی نبض ٹٹولنے لگا۔ یہاں ادھم مچا ہوا تھا۔ پنڈت درگا سہائے آف لگراواں کی تحریری رپورٹ کے موصول ہوتے ہی کئی تھانوں کی پولیس حرکت میں آگئی۔ دور دور تک جانوروں کی بازاریں کھنگال ڈالی گئیں۔ تھانے دار نے چائے کی میز پر بجو بھیا سے کہا کر پنڈت جی کو آپ ہی پر شک ہے۔ مجو بھیا نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا اور کہا۔ اصطبل تو آپ کے سامنے ہے۔ کوٹھریوں کے بکس اگر دیکھنا ہوں تو نوکر سے کنجی لے کر چلے جائیے دیکھ لیجئے۔

مغرب کی نماز کے بعد منگلو کھانا کھا کر میلی دھوتی سے منہ پونچھتا ہوا چھپر کے طاق میں بیڑی ٹٹولنے لگا۔ روپے پر ہاتھ پڑتے ہی اس کی کھنسیں نکل آئیں۔ مڑ کر دیکھا تو چندہ پیتل کی تری میں روٹی رگڑ رگڑ کر کھا رہی تھی۔ چولھے کی گرمی اور چراغ کی روشنی میں اس کا چہرہ "محرم کی روشن چوکی" کے سرخ گلاس کی طرح چمک رہا تھا۔ منگلو نے روپیہ اٹھا کر انٹی میں لگا لیا۔ چراغ سے بیڑی جلاتے ہوئے

اسے ایک خیال نے بھڑ کی طرح کاٹ لیا "کہیں روپیہ کھوٹا تو نہیں ہے" اس نے بڑی دانتوں میں دبالی۔ چراغ لئے ہوئے تیر کی طرح کوٹھری میں گھس گیا۔ بھنگے سنار کی طرح اس نے چاندی کو پرکھنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ پھیل گئے۔۔ روپیہ انٹی میں واپس چلا گیا۔ چندہ کو روٹی کھاتا چھوڑ کر دروازے کو دھڑاک سے بند کرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ چندہ نے جلدی جلدی روٹی ختم کی اور سیدھی طاق پر پہنچی۔ پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ چریسے کے یہاں بیٹھا ہوا انگو کوڑی پھینک رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر الگنی پر سے اپنا پھولدار جوڑا اٹھا لیا۔ اور کوٹھری میں چلی گئی۔ دیر تک چراغ کی روشنی میں اپنے جسم پر دھار رکھتی رہی۔ دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے چندہ نے دیکھا کہ للّی اپنی دہلیز پر کھڑی تو تو کر کے کتّے کو بلا رہی ہے۔ اس نے خنک ہوا کے جھونکے سے اپنا مہین چادر اچھی طرح سر ڈھک لیا۔ اپنی جھانجوں کو چھُن چھُن کرتی للّی کے سامنے سے گزر گئی "کہیں پانی برسا ہے" جلتے ہوئے دن کے بعد رات کی ٹھنڈی ہوا کی گدگدی پر اسے خیال آیا۔ حسین موسم کی اس پروائی نے تراب کی چوٹ چمکا دی۔ پرائمری اسکول کے سنسان علاقے کی طرف جاتے ہوئے جب وہ بھنگیوں کے جھونپڑوں کے سامنے سے گزری تو اس نے دیکھا کہ سکر دھنتر دیوار سے ٹیک لگائے پڑا ہے۔ تاڑی کے گھڑے الٹے پڑے ہیں۔ تھوڑی دور پر بھنگیوں کے لڑکے ڈھولک اور ٹیزم بجا بجا کر ناچ رہے ہیں ان کے حلقے میں اکڑوں بیٹھا ہوا اسکھندر کوئل کی طرح کوک رہا ہے۔

دیوار میں لگی ہوئی مشعل کی روشنی میں کویل کی طرح کوکنے: الا سکھبند کویل ہی کی طرح چمک رہا ہے۔ اس نے چادر اکھینچ کر اپنا منہ اور چھپا لیا۔ میدان سے گزر کر جب وہ "چھوٹے اسکول" کی پشت پہ پہنچی تو اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ جناتوں والے باغ تک سارے میں سناٹا تھا۔ بانسی کی باڑھ میں شیشم کے پیڑ کے پاس ایک شگاف تھا۔ وہ خندق میں اتر کر آہستہ سے کپڑوں کو بچاتی ہوئی آڑی آڑی چلتی ہوئی "چھوٹے اسکول" کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ کنپٹی تک کھنچی ہوئی آنکھیں کھول کر اس نے چبوترے کو تاکا جس کے کونے پر تاڑ کا درخت سپاہی کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی چھتری پر برسات کی چاند کی روشن مشعل جل رہی تھی۔ وہ پشت کے چبوترے کی سیڑھیوں پر ٹھٹھک گئی۔ پھر اچھل پڑی۔ مجو بھیا نے پیچھے سے دبوچ لیا۔

"بڑی دیر کر دی تم نے"

"منگلو کی وجہ سے"

اور اس کا منہ بند ہو گیا۔ مجو بھیا اسے اپنے کلیجے سے لگائے اس کمرے میں لے آئے جس کی کھڑکی سے دور پر کھڑا ہوا گاؤں کا پھاٹک نظر آتا تھا۔ بغیر سلاخوں کی کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی چادر میں مجو بھیا نے چندہ کی آنکھیں دیکھیں۔ سیاہ آنکھیں جن میں موتی کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ ابرو کی محراب میں لانبی لانبی پلکیں سجدے کر رہی تھیں۔ مجو بھیا نے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔

ان طویل ملاقاتوں کی تیز روشنائی میں مجو بھیا کے دل پر بنی ہوئی للّی کی چمکدار تصویر میلی ہوگئی۔ حاجی میٹھے کی دوائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ چاندی کی سفید جلد دھندلی ہوگئی۔ گھوڑا "سمند" ہونے لگا۔ عید کے کپڑوں کی آرزو میں چاندرات کی طویل ساعتوں پر جھنجھلانے والے بچے کی طرح مجّو بھیّا نے راج دین کو چاندی کے دو سو روپیوں کی گٹھری باندھ دی۔ کملاپور کے میلے میں راج دین نے کگراواں کے گھوڑے کا جوڑ خریدا اور بارہ بنکی کے کسی گاؤں میں پڑ رہا۔ جب میلہ اجڑ گیا۔ سوداگر تتر بتر ہو گئے تو اس نے پردھیا کے جنگل میں خریدے ہوئے گھوڑے کو کھاند کر پھینک دیا۔ کئی کاغذوں میں لپٹی ہوئی رسید شلوکے کی اندرونی جیب میں رکھی۔ پھر چولا بدلے ہوئے کگراواں کے گھوڑے پر منڈی سے خریدا ہوا چارجامہ رکھ کر جو چڑھا تو مان پور کے تھان پر دم لیا۔ مان پور کے جنگل میں آگ کی طرح خبر پھیل گئی۔ کگراواں والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ مختارِ عام بازار کے نیلام کی گفتگو کے بہانے آئے۔ گھوڑا دیکھا۔ چاندی کے ایال کا چنور جھڑ گیا تھا جلد مترو ہی ہوگئی تھی۔ بدن گھٹ گیا تھا۔ مگر کنوتیوں کے وہی تیور تھے۔ پاؤں پٹکنے میں وہی جلال تھا۔ مختارِ عام کی سوچتی ہوئی نگاہ دیکھ کر اتھی ایسے مجو بھیا کی چھاتی میں شیر کا دل کانپ گیا۔ مختارِ عام کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک وہ آرام کرسی کی قبر میں پڑے رہے۔ پھر گھر کے سامنے میدان میں ٹہلنے لگے۔

دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ فجّو خاں چینی لال چرسیے کے چھپر میں بیٹھے ٹھمری پر ہوتی سن رہے تھے کہ سامنے سے منگلو نکلا۔ کسی منچلے نے ہانک لگائی۔ لیکن وہ اس خریدنے کا بہانہ بنا کر پیچھا چھڑا گیا۔ گلیارے کے موڑ پر منگلو کے مڑتے ہی فجّو خاں نے بیڑی کو چٹکی سے لے کر آخری دم لیا اور اٹھ پڑے۔ کسی نے ہاتھ تک پکڑ لیا۔ مگر وہ جھٹک کر چلے آئے۔ چندہ برونٹے میں بیٹھی مونج کی ڈلیا بُن رہی تھی۔ فجّو خاں کو دیکھ کر اس نے تیور چڑھائے۔ فجّو خاں کھٹکے تو مگر چندہ کے گریبان میں دھرے ہوئے مٹھائی کے دونے پر ہاتھ ڈال دیا۔ چندہ نے ڈلیا اور سوجا ایک طرف پھینک خاں صاحب کے سینے پر مضبوط ہاتھوں کا وہ دو ہتڑ مارا کہ بھونچکے رہ گئے۔ چندہ طاق سے کھال ادھیڑنے والی چھری اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

"جات ہو خاں صاحب، کہ پکاروں محلے کو؟"

فجّو خاں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جاتے جاتے ایک خونی نگاہ ضرور ڈالی۔ چندہ کا صحت مند بدن غصہ سے کانپ رہا تھا۔ باہر نکل کر خاں صاحب نے حواس درست کر کے نگاہ کی تو اپنے کھیت کے کونے میں للّی بیٹھی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اس کے کولہے سے کولھا لائے بیٹھے رہے اور دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔

حاجی بیٹھے جب نماز پڑھنے چلے گئے تو للّی نے نقلی دار سینی میں کرکری برہیوں کے برت جانے ان پر کٹھل کے کبابوں کا گلدستہ رکھا۔ لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی سینی اٹھا کر چلی۔ مجو بھیا کی ڈیوڑھی میں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ آپ ہی آپ۔ مگر وہ

چلی گئی۔ باورچی خانے میں ٹین کی ڈبیا جل رہی تھی۔ اس کی خاموش چاپ پر آٹے کی ڈلیا میں اینڈتے ہوئے چوہے خرگوش کی طرح غائب ہو گئے۔ اس نے سینی دہلیز پر رکھ دی اور کمرے کی تیز روشنی کو دیکھتی ہوئی چلی۔ تیسرے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس میں قدم رکھتے ہی چندہ اپنی قمیص درست کرتی ہوئی، مجّو بھیّا کی گود سے اٹھو پڑی۔ للّی کو ایسا لگا جیسے سکر دمہتر نے اپنی ڈلیا اس پر الٹ دی ہو۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن جیسے کسی نے پیروں میں کیلیں ٹھونک دی ہوں۔ وہ مجسمے کی طرح نصب ہو کر رہ گئی۔ اسی پلنگ پر اسی پھولدار بستر پر یہی مجّو بھیّا مجھے چومتے چومتے نڈھال کر دیتے تھے۔ اور آج اسی پلنگ کے اسی پھولدار بستر پر "کلموہی" چندہ بیٹھی اس کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔

"کھڑی کیوں ہو؟"

مجّو بھیا ڈکارتے۔ وہی مجّو بھیّا جن کی سانسیں نہ سماتی تھیں، جو اسے دیکھ کر گھگھیانے لگتے تھے۔ وہی مجّو بھیّا اسے دھتکار رہے تھے۔ چندہ اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ للّی نے اپنے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے کو سنبھالا اور گویائی کی ساری قوت جمع کر کے آہستہ سے بولی۔

"میں جا رہی ہوں؟"

"ہاں.... دفعان ہو جاؤ؟"

مجّو بھیّا نے دوسرا جوتا مارا۔ اور کان تک کھنچی ہوئی کمان کی طرح صابر للّی

دفعتاً ٹوٹ گئی۔

"تو اب یہی دن کے لئے مارے گئے رہیں؟"

پلنگ سے اٹھتے ہوئے مجو بھیا کے چہرے پر اپنے جملے کا ردِّ عمل دیکھے ہوئے بغیر وہ مڑ گئی۔

"للّی!"

مجو بھیا کی دہاڑ نے دالان ہی میں للّی کو ڈس لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ مجّو بھیا نے اپنی دھنّی ایسا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور ایسے لہجے میں بولے جیسے داروغہ کسی عادی مجرم کو تاکید کر رہا ہو۔

"اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو گئی تو اچھا نہیں ہو گا!"

للّی نے آنکھیں اٹھا کر مجّو بھیّا کو گھورا۔ جن کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"برائی کے لیے ایک چندہ نائیں ہیں... گگراوال گھوڑا!"

مجو بھیا کے کان پر جیسے کسی لڑکے نے "چھچھوندر" داغ دی ہو۔ ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور للّی کے پھول ایسے گال پر شبرات کا پٹاخہ چھوٹ گیا۔ للّی کا داہنا ہاتھ گال سن سن کرنے لگا اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"دفع ہو جا حرام زادی.... بدمعاش.... نہیں تو بوٹی بوٹی کٹوا کے پھنکوا دوں گا!"

للّی کے گورے گورے پیروں میں پہیے لگ گئے۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح ڈیوڑھی میں گھوم گئی۔ دروازے پر ایک آدمی ہانپتے ہوئے ٹٹو کی رسّی پکڑے کھڑا تھا۔ حاجی میٹھے اس کا تنفس دیکھ رہے تھے جیسے حکیم قارورہ دیکھ رہا ہو۔ للّی اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ جب حاجی اندر آئے تو اس نے چادر سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کبابوں کا کٹورہ برھیوں کی ڈلیا میں رکھ کر پلنگ پر پٹخ دیا۔

"آؤ"

حاجی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"سو راجی ماندہ ہے آج"

"اچھا"

حاجی نے کھانا کھایا۔ پھر ڈلیا چھینکے پر ٹانگ دی۔ گھڑونچی کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور عشا کے لیے چلے گئے۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ فجر کی اذان ہو گئی۔ مگر وہ جاگتی رہی۔

ساون کی دوپہر تھی۔ سورج سیاہ بادل کی دلائی اوڑھے بیچ آسمان میں سو رہا تھا۔ بوندوں کے گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ کچے مکانوں کی مٹی نمک کی طرح گھل گھل کر گلیاروں میں بہہ رہی تھی۔ جوان جسم کی خوشبو کی طرح بوجھل اور خنک پروائی دلوں کو گرما رہی تھی۔ مجّو بھیّا کے دالان میں یہاں سے وہاں تک جاجم بچھی تھی۔ ایک سرے پر مخملی قالین پڑا تھا۔ مجّو بھیّا اور ان کے کچھ زمیندار

دوست گاؤ تکیوں سے لگے بچھو کے ڈنک کی طرح کٹیلی مونچھیں انگلیوں میں مروڑ مروڑ کر رقص دیکھ رہے تھے۔ سازندوں کے نیم دائرے کے سامنے تربھون کی ٹولی کی گلاب جان سرخ ساری باندھے چولی پہنے ناچ رہی تھی۔ بجلی بھرے ہوئے بدن کا انگ انگ بول رہا تھا۔ ہنس رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ جس کے سامنے ایک گھٹنے پر بیٹھ کر کاجل لگی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بھاؤ بتلاتی وہ نہال ہو کر اور زور زور سے اپنی مونچھیں مروڑنے لگتا۔ دل دھڑک رہے تھے روپے چل رہے تھے کہ تھانے کا سپاہی پنڈت پائیدان پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم سے بھیگا ہوا بوراا تار کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے منہ پونچھ کر مجو بھیا کو سلام کیا۔ رنگ خراب ہو گیا۔

"خیر ہے پنڈت"

مجو بھیا نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ گلاب جان گھنگھرو بندھے پاؤں کی ٹھوکر مار کر پہلے کھڑی ہو گئی پھر سلام کر کے سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ مجو بھیا کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ کگرادال کی ریاست اور دولت گھوڑے کو سانپ کے منھ کی چھچھوندر نہ بنا دے۔ انھوں نے احباب سے معذرت کی اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"میں بھیا اپنا احسان چکانے آیا ہوں"

مجو بھیا کا دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا کہ زبان بند ہو گئی۔

گگراواں والے پہلے ہی سے چوکنا تھے۔ رہی سہی کسر آپ کے قصبے کی سماۃ للی نے پوری کردی۔ اس نے آج تھانے آکر بیان دیا ہے کہ وہ گھوڑا جو آپ کملاپور سے لائے ہیں وہ گگراواں کا ہے۔ اس کے ایال قینچی سے کاٹ دیے گئے ہیں اور رنگ خود اس کی دواؤں سے بدلا گیا ہے اور وہ عدالت میں یہ بیان دینے پر تیار ہے۔"

"پھر؟"

مجو بھیا کو سانپ سونگھ گیا۔

"وہ تو بڑی خیریت ہوگئی۔ بڑے تھانیدار پیشی پر گئے ہیں چھوٹے تھانے دار اور عملہ راج گھاٹ کی ڈکیتی میں تحقیقات پر گیا ہوا ہے۔ میں ہی رہ گیا ہوں۔ آپ کے ایک خواندہ سپاہی ہوں۔ اس لئے سماۃ للی کا سابقہ مجھ ہی سے پڑا۔"

"ہوں... کون ہے یہاں؟"

"ہاں بھیا؟"

ایک نوکر بھیگی دھوتی باندھے اندر آیا۔

"پنڈت جی کو شربت پانی پلاؤ؟"

کرتے کی ایک جیب تو رنڈی پر نچھاور ہو چکی تھی۔ دوسری جیب میں ان کا ہاتھ سرسرانے لگا۔

"للی کے ساتھ کون کون تھا پنڈت؟"

"مجو بھیّا اور بخشی"

مجو بھیا دھواں دھواں پھر رہے تھے۔ گلاب جان کی بولتی ہوئی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شرابی دعوت میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ دوستوں کے ساتھ وہ بجھے بجھے قہقہے لگاتے رہے اور ہونٹوں کو مانگے کی مسکراہٹ پہناتے رہے۔ پانی کے مدھم ہوتے ہی گلاب جان اور دوستوں نے رسماً اجازت چاہی اور مجو بھیا نے ان کو سچ مچ رخصت کر دیا۔ مغرب کی اذان نہیں ہوئی تھی لیکن اندھیرا پھیل گیا تھا۔ باہری چھپر میں راج دین، بھکا، دلارے، رام دین اور بہت سے آدمی بیٹھے چلمیں پی رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی گھوڑے کھینچے گئے۔ گکراواں کے گھوڑے پر راج دین بیٹھا۔ مشکی پر دلارے اور "بجلی" پر مجو بھیا۔ پانی برس رہا لیکن یہ لوگ گلیارے کی اتھلی نہر میں چھپر چھپر کرتے چلتے رہے۔ اینچولی کے جنگل میں چلوار کے درختوں کے جھنڈ کے پاس یہ لوگ اترے۔ مجو بھیا نے کپکپاتے ہاتھوں سے گکراواں کے گھوڑے کی بھیگی بھیگی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اسے اس نگاہ سے دیکھا جیسے عاشق اپنی دولہن بنی ہوئی محبوبہ کو غیر کے ڈولے میں بٹھاتے وقت دیکھتا ہے۔ رات اور جنگل کے سناٹے میں چھتنار درختوں پر بوندوں کی ایسی ماتمی لے بج رہی تھی جیسے محرّم کے باجے۔ پھر مجو بھیا نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور کنکھیوں سے راج دین کو دیکھا جس کے ہاتھ میں بھجالی . . . . . . للی کے عریاں بازو کی طرح چمک رہی تھی۔ ان کے قریب سے ہٹتے ہی راج دین

کا بوڑھا ہاتھ اٹھا اور بجلی سی گھوڑے کے سینے میں تیر گئی۔ وہ گولی کھائے ہوئے
ہرن کی طرح اچھلا۔ لیکن راج دین کے مشاق ہاتھوں کے مار نے اسے ڈھیر کر دیا۔
راج دین اور دلارے نے آناً فاناً اس کی کھال نکال کر ایک گٹھری میں باندھ
لی۔ سر اور سُم ایک گڑھے میں دفن کر دیئے۔ جب وہ انچولی کے جنگل میں دھوم
مچاتے ہوئے بیتے کے پل سے گزرے تو راج دین نے گٹھری سمیت کھال جھم سے
پانی میں پھینک دی۔ ججو بھیّا کے چھپّر میں جھانکروں کا الاؤ لگا سب لوگ بدن
سینکتے رہے۔ ججو بھیّا بیٹھے بیٹھے پوری کیتلی کی چائے پی گئے۔ پانی تھم گیا تھا۔
پھوہ پڑنے لگا تھا۔ ججو بھیّا دیکھ رہے تھے کہ وہ باہری کمرے میں لیٹے ہیں۔ جان
کو پگھلا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ پنکھے کو کھینچتے کھینچتے نوکر سو گیا ہے اور وہ پسینے
میں ڈوبے کروٹیں بدل رہے ہیں کہ للّی آ گئی۔ اس کو بھیگا ہوا دیکھ کر پنکھا کھینچنے لگی۔
کھینچتی رہی جب تک وہ اٹھ کر نہ بیٹھ گیا۔ جب تک اس نے ڈانٹ کر نوکر کو جگا
نہ دیا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ان کے سرذی لگ گئی ہے۔ رات کے دس بج
چکے ہیں۔ رجب کی اماں اپنے بیٹے کے گھر گئی ہیں۔ نوکر سب ہندو ہیں۔ للی آ گئی
اسی طرح لہراتی ہوئی۔ لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی۔ انگیٹھی کی راکھ جھاڑی آگ
بنا کر اس کے پاس رکھی اور گرم گرم چائے بنا کر اسے پلائی اور مزید حکم کی منتظر کھڑی
ہے۔ پھر ججو بھیّا نے دیکھا کہ نوکر دوپہر میں روٹی کھانے گئے ہیں۔ ٹپیا پانی برس
رہا ہے دالان تو دالان کمروں میں بوچھار سے ٹخنوں ٹخنوں پانی بھرا ہوا ہے۔

للّی اپنے گورے گورے گھٹنوں تک بھیگا ہوا سرخ لہنگا چڑھائے تاش لیے اپنی
اینچ رہی ہے۔ آنکھوں سے تھکن ٹپک رہی ہے لیکن ہاتھ "کل" کی طرح چل رہے
ہیں۔ پھر مجّو بھیّا نے دیکھا ان کا "بجلی" بیمار ہے۔ وہ حاجی میٹھے سے لڑ لڑ کر نئی نئی
دوائیں منگا رہی ہے خود بنا رہی ہے اور اپنے سامنے کھڑی پلوا رہی ہے۔ سارے
نوکر تھک کر جا چکے ہیں۔ مگر للّی اپنے حسین کولھوں پر پھول سے ہاتھ رکھے اس طرح
گھوڑے کی کیفیت دیکھ رہی ہے جیسے یہ گھوڑا گھوڑا نہیں اس کا بیٹا ہے اس
کے جسم کا ایک حصّہ ہے۔ للّی پھر آگئی مٹکتی ہوئی چمکتی ہوئی للّی۔ اور ناخوش ہوتے
ہوئے بولی کہ بھیّا کا پیاز سوکھ رہا ہے۔ نوکروں کے کہنے پر نہ جاؤ پانی لگواؤ۔ اور
قلمی آم کے باغ کی فصل میں چھبیس سو کی نہ بکنے دوں گی۔ تین سو تو فلاں آدمی
میرے سر مڑھے جا رہا تھا۔ کسی نوکر نے للّی کو چھیڑنے کے لیے ہوائی چھوڑ دی کہ "بھیّا"
کے کھیت میں گورو تمباکو چرے جا رہے ہیں اور للّی توے کی روٹی چھوڑ کر لہنگا پکڑے کانپتی
ہوئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر نوکروں کو میٹھی آواز اور کھٹے لہجے میں ڈانٹنے لگی۔ گلاب
جان کے لہنگے کے پھولوں کی طرح چمکدار آواز اور اس کے اندر چھپے ہوئے بدن
کی طرح قاتل معانی نے تھوڑی دیر کے لیے مجّو بھیّا کو بے حس کر دیا۔ پھر جیسے کسی
طرف سے چندہ اپنی جھانجھیں بجاتی ہوئی آئی۔ اور ان کی موٹی موٹی کلائیاں
پکڑ لیں۔ ہتھیلی کے پیالوں سے ان کا چہرہ چھلک گیا۔ چندہ ان کی پھنگنی کی طرح
موٹی موٹی انگلیاں سہلانے لگی۔ مجّو بھیّا اس کی آنکھیں دیکھتے رہے۔ چمکدار آنکھیں

جن میں گنگرا واں کا ہاتھی تو خیر ایک طرف، تراب ایسا پانی دار آدمی اپنی ساری ہیکڑی سمیت ڈوب چکا ہو۔ چندہ کے گریبان میں چھپی سونے کی پوٹلیاں جن پر تراب کی ہیبت اپنے نام کی لاٹھی کھینچے پہرہ دے رہی تھی۔ بڑی دیر تک اس کی چوڑی چوڑی ہتھیلیوں پر پڑی رہی۔ چندہ کے بدن کے وہ سارے "ہفت خواں" جن میں مان پور کی سورما نگاہیں تھک کر دم توڑ چکی تھیں۔ مجّو بھیّا کے بھاری بھر کم قدموں کے نشانوں کے چراغ جلائے ان کے قدموں میں دیوالی جلاتے رہے۔ مجّو بھیّا پر نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ ان کے تصوّر نے چندہ کے بدن سے ایک ایک قطرہ نچوڑ کر پی لیا تھا۔ چندہ کے عریاں بازو ان کی گردن کو لپیٹے فضاؤں میں اڑنے لگے تھے کہ گنگرا واں کے تعلقدار پنڈت درگا سہائے کے فقرے نے ان کو ڈس لیا اور وہ بلبلا کر ہوش میں آ گئے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ چھمن چوکیدار کا صافہ ان کی کمر میں بندھا ہے سارے نوکر آنکھوں میں آنسو بھرے بھیگی بلی کی طرح دبکے کھڑے ہیں اور جب وہ تھانے دار کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اپنی ڈیوڑھی سے نکلے تو مقتول تراب کے چھوٹے بھائی نے ان کے منہ پر پڑے ہوئے رومال کو الٹ دیا۔ پھر قہقہوں کا وہ زلزلہ آیا کہ اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے رسّیاں تڑا کر نکل گئے۔ جب وہ مان پور کے گنج کے پاس پہنچے تو للّی اپنی سبز چنری ڈھلکائے نظر آئی۔ کولھوں پر پھنسے ہوئے لہنگے پر وہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور ایسی خطرناک ہنسی ہنس رہی تھی جس کو ان کے ہونٹوں نے بھاگتے ہوئے ہرن کو گولی مار کر اپنے کلیجے

سے لگایا تھا۔ مجو بھیا نے تلملا کر یہ او بدلا ہی تھا کہ سامنے سے ہاتھی پر سوار درگا سہائے
نظر آئے۔ مختار عام مشکی گھوڑے کی رکابوں پر کھڑے تھے۔ ہاتھی کے پیچھے سپاہی
کا پرا لاٹھیاں کاندھوں پر دھرے ٹھٹھول کر رہا تھا پھر انھوں نے دیکھا کہ بھری
عدالت میں جج نے چوری کے جرم میں چھ مہینے کی سزا کا حکم پڑھ کر سنا دیا۔ اور بر
بلم ان کے کلیجے میں اتر گئے۔

"راج دین"

"بھیا"

"کیا دیر ہے"

"حاجی میٹھے کی گاڑیاں بالا مئو کی بزار کے لئے لد رہی ہیں۔۔۔۔ ہانک
دی جائیں تب، اٹھا جائے"

"رام دین"

"بھیا"

"بھور ہوتے ہی تم تھانے جاؤ اور کملا پور کی بازار سے خریدے ہوئے
گھوڑے کی رسید دکھلا کر چوری کی رپٹ لکھا دو"

"بہت ٹھیک"

ہولناک سناٹے نے "جاگتے رہو" کی مدقوق آوازوں کو نگل لیا۔ آوارہ
کتے بھونکتے بھونکتے تھک گئے تو دیواروں کے سایوں اور دوکانوں کے پٹوں کی

آڑ میں پڑ کر سو گئے۔ وہ روشن ستارے جن کو مان پور والے دوسرے گاؤں والوں کی طرح "ہنسی ہنستا" کہتے تھے۔ پیپل کی پھنگی پر دیوں کی طرح جل اٹھے۔ جانوروں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی نحیف آوازیں کنمنانے لگیں۔ مارکین کے کفن کی طرح دھندلی دھندلی، سپیدی اس مشرق پر پھیلنے لگی جو کئی صدیوں سے مرا پڑا تھا۔ جاگیرداری نظام کی بیمار قدروں کی طرح ستارے سنولانے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی پریاں اپنے پروں پر نئی صبح نئے دور کے پھولوں اور کارناموں کی خوشبو لے کر مجو بھیا کے آنگن میں اٹکھیلیاں کرنے لگیں تو باہری دروازہ ہاتف کی طرح بولا اور سب دم بخود ہو گئے۔ دھرم پال سپاہی کہہ رہا تھا۔

"حاجی بیٹھے گئے"

راج دین نے جلتی ہوئی چلم کا آخری کش لگا کر پہلو دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی۔ پتا ور ایسی مونچھوں کو ہتھیلی سے برابر کیا۔ اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی سبھا گا دلارے رام دین اور مجو بھیا بھی کھڑے ہو گئے۔ آج مجو بھیا کا لنگر قدموں سے اٹھایا نہ جا رہا تھا۔ محرم کی ساتویں کو جب منجو منیہار نے بیماری کا بہانہ کر کے عباسی علم اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور چھوٹے خاں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ تو مجو بھیا نے وہ آستینیں چڑھالی تھیں جن کے کلف دار ململ کو تلی نے بڑے ریاض سے پائیدان کے ڈھکنے پر چنا تھا اور گلے میں ڈنڈ بچی ڈالے عباسی علم اٹھا لیا تھا۔ علم لے کر چلتے ہوئے انھیں اپنی اہمیت

کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب استاد مدّی نے گرجن کو "علیؑ کا لشکر" کا نعرہ مارا
تھا اور ہزاروں کے مجمع نے کلیجہ پھاڑ کر دلوں کو ہلا دینے والی آوازیں "یا حسینؑ"
کی تکرار کی تھی۔ لیکن آج مجّو بھیّا چلتے ہوئے ایسی اذیت محسوس کر رہے تھے جیسے
وہ عبّاسی علم دونوں ہاتھوں پر جھول رہے ہوں۔ وہ راج دین کے پیچھے اور دوسروں
کے آگے چل رہے تھے۔ اونگھتے ہوئے کتّے کی گردن اٹھا کر گڑگڑاتے پھر ان کے
برّاق کپڑوں کے کفن ایسے سفید جاڑے میں منہ ڈھانپ کر رہ جاتے۔ چبوترے کی
سیڑھیاں چڑھ کر ان کے موٹے موٹے ہاتھ نے آہستہ سے تھپکی دی۔ چارپائی چرچرائی۔
جھانجھیں گنگنائیں۔ شیشے کی چوڑیوں نے سرگوشی کی اور کنڈی بجی اور دروازہ
کھل گیا۔ مٹی کے تیل کی ڈبیا طاق میں جل رہی تھی۔ اس کی لال روشنی میں چندہ
کھڑی تھی۔ کیسیلی قمیص اور میلی شلوار پہنے چندہ نے دروازے سے ہٹ کر انگڑائی
لی تو اس کے جسم کے خطوط میں چراغ جل گئے۔ اٹھے ہوئے کالے کالے بال کمر
تک پڑے ہوئے تھے۔ لانبی لانبی آنکھیں نیند سے سینچی ہوئی تھیں۔ مجّو بھیّا
نے اسے مخمور نگاہ سے دیکھا۔ دل کی آرزو لہو بن کر ہاتھوں میں دوڑنے لگی۔
لیکن ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو وقت کی نزاکت نے پکڑ لیا۔ رام دین دہلیز
پر ہی کھڑا تھا۔ مجّو بھیّا کا اشارہ پاکر وہ اندر آگیا۔ دوسرے آدمی تلّی کے دروازے
پر پہنچ گئے۔ چندہ کی نیم باز آنکھوں سے اپنی پیاسی آنکھوں کو بغلگیر کر کے مجّو بھیا
نے پوچھا۔

"منگلو کو گئے کتنی دیر ہوئی"

"حاجی کے ساتھ ہی وہ ہو گئے ہیں"

چندہ اور للّی کے گھروں کی مشترکہ دیوار پر رام دین لاٹھی لگا کر چڑھ گیا۔ بلّی کی طرح اتر کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ججّو بھیا گردن جھکا کر بازو سے شانہ بچاتے ہوئے للّی کے صحن میں آ گئے۔ رام دین پنجوں کے بل چلتا ہوا گیا اور للّی کے دروازے کی زنجیر کھول دی۔ راج دین، بھکّا اور دلارے تینوں آ گئے۔ ججّو بھیا نے اپنا مخملی جوتا دروازے پر چھوڑ دیا۔ جس کو چندہ نے اٹھا لیا۔ چھپر میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک خالی چارپائی پر زمین کے رنگ کی سکڑی ہوئی دری پڑی تھی۔ سرہانے کثیف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے پلنگ پر للّی لیٹی تھی۔ چت لیٹی ہوئی تھی۔ سیاہ لہنگے کی گوٹ سے چاندی کے گھٹنے جھانک رہے تھے۔ سنگِ مرمر کی سڈول پنڈلیاں اندھیرے میں چمک رہی تھیں جیسے "پنڈشاخے" جل رہے ہوں۔ خرّاٹے لیتی ہوئی للّی کی کرتی میں وہ خربوزے دھڑک رہے تھے جن کی مٹھاس سے تراب کی زبان ہمیشہ کے لیے بندھ گئی تھی۔ باہوں کے خنجر دونوں پٹیوں پر پڑے تھے۔ جیسے ان کے قبضے ججّو بھیا کی کلائی نے توڑ لیے ہوں میلے میلے تکیے پر جھبرے جھبرے بالوں کا انبار رکھا تھا۔ جن کی لمس کی خاطر، مان بوہ کے کتنے ہی شانے قلم ہو جانا گوارا کر سکتے تھے۔ ججّو بھیا اس کے بے پناہ حسن کے طلسم میں اسیر کھڑے رہے۔ پھر ان کی گردن ہلی۔ شاید مچھر نے بائیں گال پر

کاٹ لیا تھا۔ اور ان کی گردن ہلتے ہی رام دین کی انگلیاں سنگسی کی طرح اسکی گردن کی صراحی میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھڑپھڑائی مگر دلارے اس پر سوار ہو گیا۔ وہ ذبح کی ہوئی بٹیر کی طرح مٹھی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ راج دین نے اسے آلو کے بورے میں ٹھونس کر بھر دیا۔ رام دین نے بورے کو بیٹھ پر لاد لیا۔ دلارے نے للّی کا مکان اندر سے بند کیا پھر چندہ کے گھر میں کھلنے والی کھڑکی کو للّی کی طرف سے بند کر کے دیوار پھاند کر چندہ کے گھر میں ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ سڑک پر بڑے بڑے بیلوں کا ادھا کھڑا تھا۔ بورا اس میں ڈال کر جاجم بچھا دی گئی۔ اور بیل چوک بھرنے لگے۔ ہاہا کار کرتے ہوئے بیتے کے اونچے پل پر ادھا روک لیا گیا۔ مجو بھیا نے بجلی کو دوڑا کر ہر طرف سے اطمینان کر لیا پھر طلوع ہوتی ہوئی صبح کے مٹیالے اندھیرے میں بورا دھار میں چھوڑ دیا گیا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ مجو بھیا کارتوسوں کی پیٹی ڈالے اور کندھے پر بندوق رکھے رکابوں پر کھڑے ابلتے، شور کرتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔

مان پور کے ایک ایک دل میں خودرو بیٹر کی طرح یہ بات جم گئی کہ جوان للّی بوڑھے حاجی کے پوپلے منہ پر تھپڑ مار کر کسی آشنا کے ساتھ نکل گئی ہے۔ معلوم نہیں کتنے آدمیوں نے اسے "نخلؤ" کے بازار میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کے ساتھ ہاتھ بھر کے گلاس میں لسّی پیتے دیکھا تھا۔ اس واقعے نے دوسروں پر خیر جو کچھ اثر کیا ہو۔ لیکن منگو نے جب جمعہ کے دن بال بنوائے اور چاندی

کے تاروں کا ایک گچھا اس کی قمیص کے دامن میں گر پڑا تو چپ سادھ لی۔ عصر کی نماز سے پہلے ہی چندہ نے کھانا پکا کر چھینکے کے سپرد کیا۔ دروازہ بند کر کے چارپائی کھڑی کی اور اٹین لگا لگا کر نہائی پھر اجلے کپڑے پہن کر دیر تک ٹین کی پشت کے آئینے میں کاجل لگی انگلی آنکھوں میں پھیرتی رہی۔ پھر جب چادر اٹھا کر چلی تو اس کے لال لال گالوں کو دیکھ کر منگلو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کہاں چل دیں اتنے سبیرے"

"بھیّا کے یہاں"

وہ تو چلی گئی لیکن منگلو بڑی دیر تک کھٹیا پر لیٹا ہوا جلے ہوئے ناریل کو گرگرا اتارا رہا اور دماغ میں رینگتے ہوئے بچھوؤں کو پکڑ پکڑ کر مارتا رہا۔



بادل

مراؤ کی دلہن آٹا گوندھ کر لگا چکی تھی کہ بھینس کی نئی نئی پڑیا نے رسّی تڑا لی اور اچھلتی پھاندتی باہر کی طرف بھاگی۔ دلہن پکڑنے دوڑی۔ پڑیا لے کر پلٹی تو دیکھا کہ آٹے کے کونڈے میں ایک کوّا پھڑپھڑا رہا ہے پہلے اس کو بڑا اچنبھا ہوا پھر وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ اس کے ٹھٹھے سن کر گنگھنی ساس باہر نکلی اور سب کچھ سمجھ کر بولی۔

"بہوریا ای ہمرے لسکر پور کا گیہوں ہے۔ ای ماں کوّا کا ہاتھی پھنس جائے"

یہ کہہ کر اس نے دھیمے دھیمے کلبلاتے ہوئے کوّے کو نکال کر منڈیر پر بٹھا دیا۔

اُسی لشکر پور کے ٹھاکر امانت علی نے اُتر سے پورب تک پھیلے ہوئے کئی گاؤں اکھاڑ کر پھنکوا دیئے تھے اور وہاں جھیل پیدا کر لی تھی۔ جھیل میں چڑیاں پرکانے کے لئے آبی پرندے پر کاٹ کر ڈال دیئے جاتے۔ چارہ بویا جاتا تھا اور ایک سپاہی چوبیس گھنٹے پہرہ دیا کرتا تھا۔ لشکر پور کی دوسری سمتوں میں بانس کی چوڑی اور گھنی باڑھ تھی کہ خرگوشوں کے ساتھ ساتھ گیدڑ تک رین بسیرہ کرنے لگتے اور

نوجوانوں کے تیروں اور کتوں کا نشانہ بنتے۔ ٹھاکر کا مکان ایک بہت لمبی چوڑی اور اونچی ڈھی (مٹی کا ٹیلہ) پر پھیلا ہوا تھا۔ ساری عمارت کچی تھی لیکن ایک ایک لکڑی سبک سجل اور منقش تھی۔ ڈیوڑھی کے جہازی دروازے پر مین پوری کے کاریگروں نے مہینوں ہاتھی دانت کا کام کیا تھا اس کی دوسری منزل سے خیرآباد شریف کے مخدوم میاں کی درگاہ کا گنبد نظر آتا تھا۔

ٹھاکر کے دروازے فیل خانے کے سامنے والے میدان میں خاصا لمبا چوڑا گڈھا کھدا ہوا تھا جو کوئی کمر بھر گہرا تھا اس میں لکڑیاں ٹھنسی ہوئی تھیں اور اتنے زوروں میں جل رہی تھیں کہ ان کی گرمی فیل خانے تک پہنچ رہی تھی اور ہاتھی کو نکال کر باغ میں باندھ دیا گیا تھا۔ اس آگ کے کنارے لشکرپور کے نوجوان ٹھاکر ریاست علی ایک شکرہ داہنے ہاتھ میں پکڑے آگ دکھلا رہے تھے جب شکرہ آنکھیں بند کرنے لگتا تو پاس کھڑا ہوا ملازم چڑیمار پیچھے بیٹھے ہوئے نوکروں کو اشارہ کرتا اور وہ لوگ پیپے بجانے لگتے۔ اس شور سے شکرہ آنکھیں کھول دیتا۔ اور آگ کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ تیسرا دن تھا اور شکرہ تقریباً "غلام" ہو چکا تھا۔ سامنے املیوں کے جھنڈ کے سائے میں ایک آدمی بیٹھا ہوا شیشے پیس رہا تھا۔ دوسرا لیئی کا کونڈا لیے بیٹھا تھا تیسرا ڈور پھیلا رہا تھا۔ منجھلے بھیا (صفو بھیا) کرسی پر بیٹھے کرتا

چوس رہے تھے اور "مانجھا" بنوا رہے تھے اور چھوٹے بھیّا میلوں کے پچر کے پاس گڑی ہوئی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی "چھتری" پر گرتے ہوئے کبوتروں کو دیکھ رہے تھے اور ناک سڑک سڑک کرتا لیاں بجا رہے تھے۔
جنگل خاں کو دیکھتے ہی لشکرپور کے ٹھاکر ریاست علی جو بڑے بھیّا کہے جاتے تھے۔ دوڑے۔ پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے چڑ یار کے ہاتھ میں شکرہ دے کر دیوان خانے کے ٹھنڈے مکلف تخت پر بیٹھ گئے۔ کھڑکھڑاتے ہوئے سفید غلاف کے گاؤ تکیے کو بغل میں داب لیا۔ جنگل خاں نے دروازے پر جوتا اتارا، انگوچھے سے پسینہ پونچھ کر پیروں کی گرد صاف کی اور بڑے بھیّا کے پیروں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ نفی میں سر ہلا کر بولے۔
"چودھری تو پیٹھے پر ہاتھ نائیں رکھے دے رہے ہیں۔"
"اچھّا۔"
"ہم نے بڑے بینیترے سے داؤں پھینکے مل وہ داب نہیں سہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ بادل کے برابر کوئی چاندی لادلاوے تو بھی بادل نہیں مل سکتا۔"
"تم نے میرا نام تو نہیں لیا تھا۔"
"نہیں مالک ..... ہم تو بزار کی بات کر رہے تھے۔ ہم نے کہا سوداگر بارہ ہزار دے رہا ہے، اپنے آپ۔ اگر آپ بات کریں تو پندرہ تک دے مرے گا .... مگر۔"

"ہاں ... وہ بچیں گے نہیں۔"

"وہ نہیں بچیں گے؟"

جنگل خاں اٹھ کر چلا گیا۔ بڑے بھیاّ اسی طرح تکیہ بغل میں دابے بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے ملازم نے آکر خبر دی کہ کھانا لگ رہا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جب تیسری بار نوکر نے یہی خبر دی تو وہ جھنجھلا گئے۔ کاٹ کھانے والی آواز میں بولے۔

"نہیں کھاتے کھانا۔"

"شکرہ تیار ہو رہا ہے ... ہاتھ میں لے لیجئے۔"

کسی نے گزارش کی۔

"نہیں لیتے شکرہ۔"

انھوں نے آواز کا ڈنڈا اٹھا کر دے مارا۔

کھلیان پڑنے لگے تھے۔ دھنکے ہوئے سونے کے انبار لگے تھے۔ ٹیلے کھڑے تھے۔ موٹی فصل نے دلوں میں تیوہار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جانور چکنے اور آدمی موٹے ہونے لگے تھے۔ کڑوی باتیں میٹھی ہو گئی تھیں اور بات بات پر ہنس پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ لشکر پور کی جھیل کے کنارے بڑے بھیاّ برجس پہنے بوٹ

چڑھائے داہنے ہاتھ میں شکرہ بٹھائے کھیتوں کو نہارتے چلے جارہے تھے۔ پیچھے پیچھے چڑیا ر رومال میں گوشت باندھے اور سپاہی ٹانگن کی لگام پکڑے کندھے پر بندوقیں دھرے چلے آرہے تھے کہ دور سے پالکی آتی نظر آئی۔ چار کہار پالکی میں جڑے تھے چار خالی چل رہے تھے ایک سپاہی پہاڑی ٹٹو پر بیٹھا دھمکتا چلا آرہا تھا۔ بیل گاڑی کو دیکھ کر کہار نے آواز دی۔

"بھڑکن ہے"

پھر ادھر کی کھونٹیاں دیکھ کر ہانک لگائی۔

"لکھراش (قلم تراش) ہے"

بڑے بھیا نے چڑیا کو گولی ماری اور پالکی کو گھورا۔

"کہاں کی پالکی ہے؟"

بے اختیار ان کے منھ سے نکل گیا۔

ٹٹو پر بیٹھے سپاہی نے سلام کیا اور اتر کر جواب دیا۔

"مہرولی کی بٹیا کھیر آباد جائے رہی ہیں"

سپاہی نے ذرا دیر ان کے دوسرے سوال کا انتظار کیا۔ پھر اچانک ٹٹو پر بیٹھا اور دوڑ کر پالکی پکڑ لی۔

اماں کھانا کھا کر پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی گلوریاں لگا لگا کر کھا رہی تھیں اور پکار پکار کر عورتوں کو تقسیم کر رہی تھیں چھوٹے بھیا ان کا پچھوڑا

پکڑے بیٹھے تھے اور گلوری کے لئے ٹھنک رہے تھے وہ کبھی چمکارتیں پچکارتیں اور کبھی جھڑک دیتیں۔ پھر منجھلے بھیّا باہر سے بھاگتے ہوئے آئے اور ایک لفافہ ان کی گود میں ڈال کر منھ سے ریل گاڑی کی سیٹی بجاتے ہوئے بھاگ گئے۔ انھوں نے کچھ کہنے کے لئے منھ کھولا ہی تھا کہ چھوٹے بھیا بھی سٹڑی ہو گئے۔ اگالدان میں پیک تھوک کر انھوں نے خط کھولا۔ بڑے بھیّا کا خط دیکھ کر چونکیں۔ خط پڑھ کر چپ چاپ بیٹھی رہیں آنکھیں سوچتی رہیں۔ نوکروں کا کھانا تقسیم کرانے باورچی خانے گئیں تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خط چولھے میں ڈال دیا۔

دوپہر میں جب منجھلے بھیّا اور چھوٹے بھیّا دونوں سو گئے۔ نوکر چاکر اپنی اپنی جگہ پر ہو گئے، دوہرے دالان کے پچھلے کمرے کے دروازے اندھی اور بہری بوا پنکھے کی رسّی لے کر بیٹھ گئیں اور جھوم جھوم کر پنکھا کھینچنے لگیں تب اماں نے بڑے بھیا کو طلب کیا۔ بڑے بھیا شرماتے ہوئے ٹیڑھے ٹیڑھے آئے اور اندھیرے کمرے میں تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ اماں بھی اپنے کھرّے پلنگ پر سنبھل کر بیٹھ گئیں، اماں نے کھانس کر کمرے پر چھائی ہوئی ناگوار خاموشی توڑی اور بولیں۔

"مہرولی والے اس گھر کو جانتے ہیں . . . . خیر اس گھر کو جو ادھیں جانتا کون نہیں ہے۔ لیکن اللہ بخشے تمھارے باپ سے اور مہرولی کے چودھری بھائی

سے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ آنا جانا تھا۔ کھانا پینا تھا۔ ہڈی بوٹی میں بھی وہ برابر کے ہیں۔ لیکن"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئیں پھر دھیمی آواز میں اسی طرح بڑے بھیّا کی مخالف سمت میں دیکھتی ہوئی بولیں۔

"لڑکی ذرا صورت میں کم ہے"

"اب سے دو برس پار.... جب چھوٹے بھیّا کو جوڑی آئی ہے اور میں مقبول میاں کے پاس گئی ہوں تو وہاں چودھرائن بھی تھیں اور بٹیا بھی تھی... چودھرائن خیر سیکڑوں میں ایک ہیں۔ لیکن لڑکی کم رو ہے۔ پھر گھر بھی سوتیلا ہے... اگر چودھرائن کے لڑکا نہ ہوا تو لڑکی جائداد کی بھی وارث ہوگی۔... صورت کی کمی کے ساتھ یہ بیشی بھی ہے..... یہ سب تو تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ میرا کیا ہے.... ایک بہو صورت میں کم ہوگی تو اللہ رکھے دو بہوئیں صورت میں زیادہ آجائیں گی۔ پھر نگوڑی صورت بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے ایک سے ایک صورت داریں سال دو برس میں کوّے ہڑانے لگتی ہیں.... شریفوں میں صورت دیکھی بھی نہیں جاتی..... شکل تو رنڈی پتریا کی دیکھی جاتی ہے"

"کل جمعہ ہے مبارک دن ہے.... کہو تو میں نائی بھیجوں"

"تم تو بھیا بالکل گبرینے بیٹھے ہو"

"اچھا جاؤ.... میں انتظام کرتی ہوں"

لگناؤں کے بڑے بھیا جو بارات کے کھانے کے منتظم تھے ڈیوڑھی کے

صحن میں لگے ہوئے شامیانے کے سامنے ڈھیر برتنوں۔ کے کھانچوں کے پاس آکر

کھڑے ہوگئے۔ تہرولی کے چودھری کا نے پہچان گڑگڑاتے ہوئے دونوں ابرودو

کو اچکاکر ان کی طرف دیکھا۔

"نائد ناجی، سچ کہتا ہے"

"کیا"

"کوئی پانچ سو تو خالی لیٹر (دادھے) ہیں۔ ہاتھی گھوڑے الگ... آدمی

کا کوئی حساب نہیں"

"اور"

"اور کیا؟.... رنڈی پتریا، بھانڈ کشمیری، آتش باز باجے گاجے سب"

تہرولی کے چودھری کھرے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر پاؤں لٹکا کر لال

نری کا جوتا پہنا اور کھڑے ہو گئے۔ ملازم جوان کے پلنگ کے پیچھے کھڑا ابانس کا فرشی

پنکھا ہلا رہا تھا۔ خاموش کھڑا رہا۔ چودہری نے اپنے کسمسلے ڈھیلے پاجامے کو کھینچ کر

توند پر چڑھایا۔ منہ میں زبان گھما کر کھڑا رہا۔ لگدی زمین پر کھینچ ماری۔ اور بڑے

رکھ رکھاؤ سے بولے۔

"کھانے کی فکر ہے؟"

"ہے تو۔"

"گاؤں میں سینکڑوں بجرا اکھڑا ہے۔ کھلوا لو۔ گھی تو بے حساب ہے ہی
رہا آٹا تو رام لال کو بلا کر حکم دے دو اور دیکھو۔"

"ہاں۔"

"زینو تو ایک ہی ہے نا ..... دو چار ہوتیں تو فکر کی جاتی۔"

گجگا داں والے اپنا کلف لگا پائجامہ کھڑکھڑاتے ہوئے ایک طرف ہو گئے
چودھری نے عصر کی نماز کے لیے وضو کراتے ہوئے ملازم کو بھیج کر سکونی کے بچے راج
سنگھ کو بلوایا وہ ریشمی کرتا، مہین دھوتی اور جودھپوری جوتا پہنے آئے اور کھچڑی
قلموں تک کی خبر لیتے ہوئے سفید مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے شامیانے
کے سجاؤ کا تنقیدی نظروں سے معائنہ کرنے لگے۔

"بھیّا۔"

"کہو۔"

"ٹھاکر پور والے تو عزت آبرو دینے پر تلے ہیں۔"

"کاہے۔"

"ارے ابھی پرسوں خبر آئی کہ برات میں ستو لہر وادر کوئی پانچ سو آدمی آئیں
گے اور آج خالی لہر دیا پانچ سو چڑھالائے ہیں آدمیوں کو تو جھونکو چولھے بھاڑ میں۔"

مکونی کے ٹھاکر جے راج سنگھ اسی طرح شامیانہ دیکھتے ہوئے بولے۔

" تم اپنے مسلمانوں کی چنتا کرو مسلمانوں کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندو ہزار بھی اتر پڑے تو کھلا کھلا کر مار ڈالوں گا اور سو پچاس آدمی کا کھانا بچا لاؤں گا۔"

" اچھا بھیّا جیسے آدمیوں کا بندوبست ہو گیا۔ ۔ ۔ جانوروں کا کیا ہو گا۔"

اب مکونی کے ٹھاکر نے چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

" لڑکی کا بیاہ ہے چودھری۔ ۔ ۔ ۔ کہ گڑیوں کا کھیل؛ جب چارا چک جائے تو رعایا کے کھیتوں پر سپاہی بٹھا دو اور حکم دو کہ براتی کاٹ لے جائیں۔ برات بعد تخمیناً بانٹ دینا۔ ۔ ۔ ۔ کا یار تم ہوں آدمی ہو۔"

ھردولی کے چودھری شرماتے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ پھر مکونی کے ٹھاکر کے پاس ایک خوشامدی آکر کھڑا ہو گیا اور جھوٹ موٹ کا غصہ کرتے ہوئے ان آدمیوں کی شکایت کرنے لگا جنھوں نے بارات والے کنوئیں میں اتنی شکر جھونک دی تھی کہ پانی شیرہ ہو گیا۔

ھردولی کے اتر میں آم کے باغوں کے یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے سلسلے میں بارات پڑی تھی۔ دور دور تک صرف آدمی اور جانور نظر آتے تھے۔ اساڑھ بھر چکا تھا۔ پہلا ڈونگرا ہی ایسا ٹوٹ کے برسا تھا کہ لو کی ماری زمین جل تھل ہو گئی۔

پھر آسمان سے ہری دوب برسی اور سارے میں پھیل گئی۔ اونچے مغرور درختوں نے نہا دھو کر ہرے پتے پہن لیے۔ سبزے کے عاشق بادل ایک، آدھ دن کا ناغہ کر کے آتے اور کھلیان کے کھلیان موتی لٹا کر چلے جاتے۔ حدِ نگاہ تک ہرے کھیتوں، کاہی باغوں، مٹیالی نم پگڈنڈیوں اور پانی سے رستی ہوئی کچی سڑک کا منظر پھیلا پڑا تھا۔ لڑکے بالے نہاتے دھوتے جانوروں اور سجتے بنتے براتیوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے بڑے باغ کے شامیانے کے وسط میں نیم دائرہ بناتی ہوئی چارپائیاں پڑی تھیں ان پر شیروانی پوش باراتی لدے بیٹھے تھے۔ بیچوں بیچ میں لشکر پور کے ٹھاکر امانت علی کا بیٹا ٹھاکر ریاست علی دولھا بنا بیٹھا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں کھڑی تھیں................کالی آنکھوں میں اور سانولے چہرے پر شباب کی چھوٹ نے روشنی کر دی تھی۔ وہ سرخ زری پوت کا پاجامہ، سرخ اصطنبولی اطلس کا جامہ پہنے کمر میں کارچوبی دوشالہ باندھے اس میں مرصع قبضے کی تلوار لٹکائے آدھا آدھا سہرہ دونوں کنپٹیوں پر ڈالے پاؤں پر پاؤں رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے خاندان کا قدیمی بھاٹ کان پر ہاتھ رکھے، تیوروں پر آگ جلائے سگنی ہوئی پاٹ دار آواز میں گا رہا تھا۔

اُدی لسکر پور کے مالک نکرے ہیں (نکلے ہیں)

جون کریں باگھن سے ٹھٹکرائی!

بادل کا بادل دھرے کاندھے پر

اور ہاتھاں جمدھر جیسے چمکے بجری
انگریجن کے کیسے کیسے گھوڑا ہاتھی
کاٹ کے پھینکین ہیں جیسے کھیرا ککڑی
جب دیکھیں "گورے" تو ہاں سے نایں چلت
تب گت موتن بھاگے بانس بریلی

ای لسکر پور کے مالک بیٹھے ہیں
جون کریں باگھن سے ٹھکرائی

پھر شفق نکلی جو سیاہ بادلوں کے پس منظر میں اور روشن اور حسین ہو گئی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد بارات اٹھنے لگی۔ شامیانے کے پاس محمود آباد راج کی "ٹلر پیاری" (ہتھنی کا نام) چاندی کا ہودج لادے، کار چوبی جھول پہنے، سفید گھنٹے لٹکائے کھڑی تھی۔ دولھا کے سوار ہوتے ہی بارات حرکت کرنے لگی۔ کان سے ٹاپ تک سجے ہوئے الھڑ گھوڑے اٹکھیلیں کرنے لگے۔ مہاوتوں نے مار مار کر ہاتھیوں کو سیدھا کیا۔ چنے ہوئے تیس چالیس اہڑ ساتھ تھے جن کے بیل جھولیں پہنے سنگوٹیاں چڑھائے گھنگھرو بجاتے نخریلی چال چل رہے تھے۔ کئی باجے پوری آواز سے بج رہے تھے۔ کئی آتش باز ایک ساتھ بان چھوڑ رہے تھے، چرخیاں چلا رہے تھے اور گولے داغ رہے تھے۔ بہت سی طوائفیں، اور میراثی اور بھاٹ آگے پیچھے مبارکبادیاں گاتے چل رہے تھے سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گھروں

کے دروازوں پر بندھے ہوئے جانور بھڑک رہے تھے اور عورتیں اور بچے کانوں تک آنکھیں پھاڑے بارات دیکھ رہے تھے اور اپنے قدموں میں برستے ہوئے نچھاور کے پیسے لوٹ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے میدان میں پیشوائی کے لیے آدمیوں کا جنگل کھڑا جھوم رہا تھا اور اس کے پیچھے گیسوں اور ہنڈوں کی تیز روشنی میں مہرولی کی ڈیوڑھی اپنے ماتھے پر جگمگاتی ہوئی "میور" پہنے چمک رہی تھی، ایک طرف سے آدمیوں کو چیرتا ہوا مہرولی کا سدھا ہوا، سجا ہوا بادل (ہاتھی کا نام) آیا اور دولھا کو سلام کر کے گھوم گیا۔ اور اپنے عقب میں بارات لیے ہوئے "دوالے" پر چلا۔ دولھا نے کنگنے اور انگوٹھی اور مہندی سے مرصع ہاتھ نکال کر سہرے کو ایک طرف کر دیا۔ مہرولی کے ہاتھی کو نچا اور بادل کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر مبارکبادیاں گائی جانے لگیں اور مہرولی کا بادل ایک طرف گھوم گیا۔ اس کی جگہ پر محمود آباد راج کی ٹبلر پیاری جم کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنی سونڈ میں بھرا ہوا معطر پانی ان عورتوں پر پھینکا جو زرق برق لباس پہنے زیوروں میں گندھی ہوئی ڈیوڑھی پر ہنسی کھڑی تھیں ان عورتوں اور لڑکیوں کو ڈھکیل کر ایک توانا عورت چاندی کے موٹے موٹے زیوروں میں کھنکتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے ایک پیتل کا تھال سنبھالے آئی اور ہاتھی کے قدموں پر اس تھال سے آرتی سی اتارنے لگی جس میں گھی کے چراغ تھے پان کے بیڑے اور پھولوں کے گجرے تھے اس عورت کے مڑتے ہی لڑکیوں نے تل اور بھنے ہوئے چاول اور پھول کی پتیوں سے مٹھیاں بھر بھر کر دولھا پر دھاوا

کیا۔ اس بار میں چھت پر کلبلاتی ہوئی عورتوں نے بھی اپنی توفیق کے مطابق حصہ لیا۔ جب تمام شگون پورے ہو گئے تب بٹلر پیاری کو مہاوت نے بٹھا دیا اور گجگا واں کے بڑے بھیا نے دولھا کو گود میں بھر کر اتار لیا۔ اور شامیانے کے قلب میں لگے ہوئے نمگیرے کی مسند پر بٹھا دیا۔ اس کے تین طرف چاندنی لگے تختوں کے چوڑے چوڑے حاشیے تھے جن پر معزز اور شیروانی پوش باراتی بیٹھے ہوئے تھے۔ زمین پر پیال بچھا کر فرش لگا دیا گیا تھا اس پہ آدمی ڈھیر تھے جب ذرا اٹھنے بیٹھانے کا ہنگامہ ختم ہوا تب لشکر پور اور مہرولی کے بڑے بوڑھوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ ہوتی رہیں۔ پھر ایک بزرگ جو رشتے میں ٹھاکر ریاست علی عرف رسّو بھیا کے ابا ہوتے تھے دولھا عرف رسّو بھیّا کے پاس آئے۔ ان کے کان میں اپنا پوپلا منھ رکھ کر ڈکارے۔

"مہرولی والے ایک لاکھ اکیاون ہزار مہر مانگت ہیں"

"آپ پورے دو لاکھ کہہ دیجئے"

رشتے کے ابا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

نکاح کے بعد کھانے کی قیامت برپا ہوئی۔ شرابی باراتیوں کو شراب، افیمچی باراتیوں کو افیم (افیون) اور بھنگڑی باراتیوں کو بھنگ تقسیم ہوئی۔ جانوروں

کو راتب تول تول کر دیا گیا اور چارہ کھیتوں سے گیسوں کی روشنی میں کٹوا دیا گیا۔
بھر ولی اور بھر ولی کے ارد گرد کئی کئی کوس تک کی آبادی سمٹ آئی تھی اور گاؤں بھر
میں برپا ناچ کی محفلوں کے گرد بھیڑ لگائے عیش کر رہی تھی۔ اس گھڑی ان کی زندگی
کے سارے دکھ بھر ولی کے چودھری کی اکیلی بٹیا کی شادی میں چاکری کر رہے تھے اور
برسوں سے بن باس پر گئے ہوئے سکھ واپس آ گئے تھے اور ان کو کھانا کھلا رہے تھے،
حقے پلا رہے تھے اور ناچ دکھا رہے تھے۔ جب مرغے بولنے لگے تب بھر ولی کے چودھری
اس پھولداری سے باہر نکلے جو ان کے دور تک پھیلے ہوئے پکے مکان کی پشت
پر لگی تھی اور جس میں وہ بارات کی آمد کے وقت سے پردہ کیے پڑے تھے کہ کہیں باراتی
ان کا منھ نہ دیکھ لیں اور ان کے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ وہ ہر طرف سے اطمینان
کرتے ہوئے بجے راج سنگھ کے خیمے میں پہنچے جہاں ٹھاکر چوکی پر بیٹھے ہوئے آدمیوں
کو ناشتے کے لیے ہدایتیں دے رہے تھے۔

"بھیا"

"ہاں"

"ایک گزارش ہے"

"کہو"

"اب آپ بھی کھانا کھا لیجیے"

"میں چودھری تمہارے یہاں کا کھانا کھانے تھوڑی آیا ہوں ۔ ۔ ۔ میں تو

بیٹوا (لڑکی) کو بدا (رخصت) کرنے آیا ہوں"

"وہ تو ٹھیک ہے ..... لیکن"

"دیکھو چودھری اس رشتے میں بات نہ کرنا ورنہ میں ابھی ہاتھی کھنچوا کر سوار ہو جاؤں گا۔ ہا .... ہاں"

"میری جو غلطی ہو اسے"

"اس پر بات کرنے کوئی آنا ..... ہاں بے کلوا؟"

"مالک"

"تیار ہے؟"

"تیار ہے مالک"

اور کلوا بھنگ کا لمبا مراد آبادی گلاس ہتھیلی پر رکھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

جب صبح دھوپ پھیل گئی اور دولھا ناشتہ کر چکا تب ریشمی چوڑی دار پاجامے پر زربفت کی شیروانی پہنی گلے میں بدھیاں ڈالیں اور سہرا باندھ کر اندر سلام کرنے چلا۔ ڈیوڑھی سے اندر صحن کے شامیانے اور شامیانے سے دالانوں، کمروں، صحنچیوں اور چھتوں تک عورتیں ہی عورتیں بھری تھیں۔ بیبیاں دولھا کو اپنے حلقے میں لئے لڑکیوں کی مار سے بچاتی ہوئیں اور لڑکیوں کو جھوٹ موٹ جھڑکتی ہوئیں چوکے پر لے گئیں اور مسند پر بٹھا دیا۔ یہاں خوشدامن نے اس کی بلائیں لیں اور گاؤ کو ٹکا کر اس کی پیٹھ سے لگا دیا اور سہرا الٹ دیا۔ دولھا کی نگاہ اس تندرست

سفید ہاتھ پر پڑی جو گٹّے سے آدھی کلائی تک زیوروں میں گندھا ہوا تھا اور جس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ اس نے بادل کو دیکھنے کے بعد پہلی بار اپنی نگاہ کو آوارہ چھوڑا تھا۔ وہ دیکھتا رہا پھر اس کی نظر یاقوت پر رکھے ہوئے اُس شمعدان پر پڑی جس کے چاندی کے دستے پر سونے کا نفیس کام چمک رہا تھا۔ اس کی بیوی زینت آرا بیگم کی سوتیلی، جوان، خوبصورت ماں بھاری جوڑا پہنے، عطر میں بسی ہوئی اس کے پاس بیٹھی تھیں، عورتوں کے ریلے کو روکنے کے لئے ایک بار وہ گھومیں تو پھولوں اور زنجیروں سے گندھی ہوئی معطر، سیاہ، دراز چوٹی اس کے زانو پر لہرا گئی۔ جب آپا کو یقین ہو گیا کہ نوجوان داماد ان کو بے طرح گھورے جا رہا ہے تو وہ تھوڑا سا شرما گئیں اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کے لئے میراثنوں کو گانے کا حکم دے دیا۔

میراثنوں نے عورتوں کو ڈھکیل ڈھکیل کر اپنے لئے جگہ بنائی پھر اس حلقے میں ان کا ایک گروہ آیا جو لانبے کرتے، اونچی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے چمرودھے جوتے پہنے تھا۔ نقلی مونچھیں لگائے تھا۔ سات سات ہاتھ کی بھیانک لاٹھیاں باندھے تھے۔ اور اپنی پھولی پھولی پگڑیوں سے نکلتے بھاگتے بالوں کی مسلسل گوشمالی کر رہا تھا۔ کسی نے ڈھولک پر تھاپ دی۔ اور وہ سب ایک ساتھ پوری آواز سے مردانی گالیاں گانے لگیں جب دولھا کے سارے رشتہ دار ختم ہو گئے اور گالیاں خرچ ہو گئیں اور ان کے دم پھول گئے تب دولھا کی آپا نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

وہ مردوں کی طرح چھوٹی ذات کی جوان عورتوں کو چھیڑتی ہوئی چلی گئیں۔ پھر ایک رشتے کی دو یا ساس نے اس کا عزیزدار بیویوں سے تعارف کرایا جب یہ مرحلہ بھی انجام پا گیا۔ تب آپا نے دوبیوں سے بھری ہوئی چاندی کی کشتی لاکر اس کے سامنے رکھ دی۔ اور چاہا کہ دولھا کا ہاتھ اس سے چھوا دے۔ لیکن دولھا نے دونوں ہاتھ سمیٹ کر گود میں بکھرے ہوئے پھولوں میں چھپا لئے۔ آپا نے مسکرا کر مٹھی میں دبے ہوئے مخمل کے بٹوے کی ڈوریاں کھینچیں اور اس میں سے پانچ اشرفیاں نکال کر کشتی میں رکھ دیں لیکن اس نے اپنے ہاتھ باہر نہ نکالے آپا نے پھر بٹوہ کھولا اور چھ اشرفیاں نکال کر کشتی میں رکھ دیں اور شیریں ناگواری سے بولیں "اے بھیا اب تو لے لو" لیکن بھیا سفر میں کنکھیاں ڈالے اور گود میں ہاتھ چھپائے اسی طرح بیٹھے رہے۔ اب بیبیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ آخر بڑی دیر کے بعد شہ بالا بولا۔

"بھائی جان ہاتھی مانگتے ہیں"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر عورتیں کرّاڈں کرّاڈں بولنے لگیں۔ آپا نے اس کے کندھے پر جوان ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ نیک، شگون کی بات ہے اسے لے لو۔ پھر ہاتھی بھی دیں گے"

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اندر کی بات باہر پہنچی، چودھری نے سنا تو پہلے مسکرا کر چپ ہو رہے پھر کہلوایا کہ وہ ہاتھی پسند کریں میں خرید دوں گا اس پر جواب

ملاکہ ہم مہرولی کا ہاتھی لیں گے۔ یا دل لیں گے اور بادل ہی پر چڑھ کر لشکر پور جائیں گے۔ جناتی دلڑ کے والے، اور براتی دونوں ہی لطف لے رہے تھے۔ معاملہ سسر داماد کا تھا بولتا کون ؟ ادھر چودھری کے تیور پر بل پڑ گئے۔ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر ٹھہر گئے۔ پھر جواب کی منتظر ناون کی طرف نگاہ کی اور بولے۔

"دولھا سے کہو سلامی کا روپیہ لے کر میرے پاس آئے"

پھر ہٹو بچو کو شور ہوا اور دولھا بغیر سلامی کا روپیہ قبول کئے، خالی ہاتھ شہ بالا کے ساتھ اپنے نائیوں اور خدمت گاروں کے جلو میں آکر چودھری کے پلنگ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سلام کے جواب میں بیٹھنے کا حکم پاکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سہرا اس کے شانوں پر پڑا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی برس رہی تھی۔ چھوٹی ڈاڑھی گھنی سیاہ مونچھیں کھڑی تھیں چودھری اس کی شخصیت کا رعب دیکھتے رہے پھر پیچوان کی نَے منھ سے نکال کر پٹی پر ڈال دی۔

"اس گھر کی ریت ہے کہ چوتھی سے پہلے داماد کو منہ نہیں دکھایا جاتا لیکن تم نے ایسی ضد کی کہ صدیوں کے رسم و رواج توڑنا پڑے اور تم سے بات کرنا پڑی زینو۔ مہرولی کی وارث ہے زینو تمہاری بیوی ہے۔ یعنی مہرولی تمہاری ہے۔ اسی لئے میں نے جہیز کے سلسلے میں کوئی اہتمام نہیں کیا ورنہ جہیز تو میں اتنا دیتا کہ لشکر پور میں رکھنے کا ٹھکانہ نہ ہوتا۔ رہا ہاتھی کا معاملہ تو خدا کے فضل سے تم خود ہاتھی نشین ہو اور میں تمھیں ہاتھی دے سکتا ہوں۔ براتی اور جناتی دونوں ملا کر کوئی درجن بھر

ہاتھی یہاں کھڑے ہیں تم پسند کرو میں خرید دوں۔"

"میں نے ہاتھی کہاں مانگا؟ . . . میں تو بادل مانگتا ہوں۔"

چودھری جو اپنی پر اثر تقریر سے مطمئن ہو چکے تھے چونک پڑے۔ گردن جھکا کر تھوڑی دیر پیچوان کی نئے سے کھیلا کیے پھر آنکھ اٹھا کر دولھا کو دیکھا۔ آنکھوں نے دولھا کو اٹھا کر نگل لیا۔

"بادل ہاتھی نہیں ہے . . . . بادل میرا بیٹا ہے . . . . اور بیٹیوں کے جہیز میں بیٹے نہیں دیے جاتے۔"

یہ کہہ کر چودھری نے اپنے جوتے پہنے اور پائجامہ اوپر کھسکاتے ہوئے اٹھ گئے۔ ٹھاکر امانت علی رئیس لشکر پور نے اپنے نائیوں اور خدمت گاروں اور ان آدمیوں کو جو ادھر ادھر سے سمٹ آئے تھے سوچتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے دیکھا اور ان تمام آنکھوں میں اپنی بے عزتی کی یکساں عبارت پڑھ لی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنا وزنی سہرا اتارا۔ شہ بالا نے ہاتھ پھیلا دیے لیکن انھوں نے ایک خدمتگار کی گود میں پھینک دیا اور کھڑے ہو گئے تیز تیز قدم رکھتے ہوئے بارات کی قیام گاہ کی طرف چل پڑے۔ بوڑھے بوڑھے باراتیوں نے لپک کر انھیں آلیا۔ لیکن وہ ہر سوال، ہر گزارش اور ہر مشورے کو ٹھکراتے ہوئے شامیانے پر آ گئے اور بہادت کو حکم دیا کہ "ہٹلر پیاری" فوراً سجی جائے۔

سرخ پوت میں لپٹی ہوئی فنیس مہرولی کی ڈیوڑھی سے اٹھی اور رینگتی ہوئی آکر بارات کے شامیانے کے پاس بیٹھ گئی۔ سارے باراتی قیام گاہ پر سمٹ آئے۔ سارے جناتیوں کے بال لمبے ہو گئے آنکھیں چھوٹی ہو گئیں۔ دور دور تک کوئی آواز نہ تھی۔ سناٹا ایک بھیانک سناٹا چیخ رہا تھا..... مکونی کے ٹھاکر جے راج سنگھ اور جھام پور کے بڑے بھیّا شیخ محبت علی دوسرے بڑے بوڑھوں کے ساتھ شامیانے کے پہلو میں لگی ہوئی چھولداری میں بیٹھے بیٹھے سوچتے رہے کہ وہ کیا کریں..... مہرولی کے چودھری اپنے کینوس کے چھوٹے سے خیمے کے کھرّے پلنگ پر پڑے تھے۔ چلم جل گئی تھی مکھیاں شربت کے گلاس پر لپٹی ہوئی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ ان کے پسینہ بہ رہا تھا۔ لیکن وہ کونے میں کھڑے ہوئے فرشی پنکھے کی خدمت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ وہ تنہائی چاہتے تھے۔ تنہائی جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے خود ان کی زندگی کی کتاب کھول کر رکھ دی تھی اور وہ اس میں کھو گئے تھے۔ ڈوب گئے تھے۔

لکھنؤ کے حاکم شیخ جب مغل شہنشاہ سے ٹکرانے لگے تب صفدر جنگ وزیر الممالک کی خلعت پہن کر چڑھ آئے۔ لیکن شیوخ کی تلواریں دیکھ کر گومتی کے کنارے پڑے

رہے ایک رات جب چاند سو رہا تھا۔ تارے سو رہے تھے گومتی سو رہی تھی اور خود شیوخ کی تقدیر سو رہی تھی صفدر جنگ نے دریا اتر کر شبخون مارا اور قلعے پڑھاوا کر کے وہ تلوار کاٹ کر پھینک دی جو پھاٹک پر لٹک رہی تھی اور ایک زمانے سے شیوخ کی ہیبت کے نام پر سجدے وصول کر رہی تھی۔ اسی حکمراں خاندان کے ایک بزرگ شیخ تہور علی نے سیتاپور میں دریائے گھاگھرا کے کنارے تہرولی نام کے گاؤں میں پناہ لی۔ اور ایک کچی گڑھی بنا کر رہنے لگے۔ تہرولی کے شیخوں نے مدتوں اس طرح زندگی کی کہ جب زمین تنگ ہو جاتی تو اطاعت قبول کر لیتے اور جب تلواروں پر زنگ لگنے لگتا اور گھوڑوں پر چربی چڑھنے لگتی تو آس پاس کے علاقے داب کر بغاوت کر دیتے۔ آخر آخر جب واجد علی شاہ شکار کے لئے نکلا اور بہرائچ جاتے جاتے تہرولی کی طرف گھوم پڑا تو شیخ مظفر علی نے تلواریں ہلا ہلا کر اپنے خاندان کی روایات کا احترام کیا۔ پھر شتر سوار گزار علاقوں میں روپوش ہو گئے نواب نے پیام بھیجا کہ اگر حاضر ہو جائیں تو جان کے ساتھ ساتھ علاقہ بھی بخش دوں گا۔ حاضر ہو گئے۔ نواب نے شیخ مظفر علی کے بجائے چودھری مظفر علی کہہ کر مخاطب کیا اور پوچھا کہ سالانہ کیا دو گے۔ جواب دیا کہ سالانہ راجاؤں سے لیجئے ہم سپاہی ہیں جب طلب کیجئے گا آل اولاد سے آئیں گے اور نچھاور ہو جائیں گے۔ "اختر نگر کا پیا" "جانِ عالم" اس جواب کے بانکپن پر تڑپ اٹھا اور خلعت پہنا کر بہرائچ کے لئے سوار ہو گیا۔ جب آزادی کی پہلی لڑائی چھڑی اور حضرت محل لکھنؤ

ہار کر بھاگیں تو" بادن فقیروں کی سرکار" خیرآباد کے پاس سو پچاس سواروں کے جلو
میں ایک دس بارہ برس کا لڑکا کمیت گھوڑے پر سوار ہتھیار لگائے سلام کے لئے
پیش ہوا۔ پوچھا" یہ کون ہے" آواز آئی یہ انھیں چودھری مظفر علی کی اکلوتی نشانی
ہے جنھوں نے ہزار سواروں کے ساتھ انگریزوں سے چاند باغ چھین لیا تھا اور
اپنے خون سے گومتی کو سینچ دیا تھا۔ جوگن ملکہ نے دو پوری روپے کی نذر قبول کی اور
اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ تیل گاؤں سے رسد لانے والا ہاتھی ساتھ کھڑی ہوئی زخمی
ہتھنی کو چھیڑ رہا تھا۔ حکم ہوا، چودھری غضنفر علی ابن چودھری مظفر علی کو بخشش دو۔
چودھری غضنفر علی کے وہ عزیز جو لکھنؤ کی شیعہ حکومت سے پشتینی عداوت رکھتے تھے
اور انگریزوں کے شانہ سے شانہ ملا کر گھوڑے دوڑا چکے تھے اور غدر کے بعد راجہ
نواب بن چکے تھے اس وقت آڑے آئے اور چودھری غضنفر علی کے لئے اتنا بچا
لیا کہ وہ اپنے علاوہ ملکہ کے بخشے ہوئے ہاتھی اور ہتھنی کی بھی پرورش کر سکے۔ چودھری
غضنفر علی کے سترہ بیٹے ہوئے لیکن سب شیرخوار ہی مر گئے۔ آخر ان کی پانچویں
بیوی سے اٹھارویں بیٹے چودھری اکبر علی ہوئے۔ اور ہر ولی کے چودھری کے نام
سے بجنے لگے۔ اور جو اس وقت کینویس کے خیمے میں پڑے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ
انھوں نے کیسے کیسے جتن کیے، کیسے کیسے پاپڑ بیلے۔ کن کن راجاؤں کے پشتینی
مہاوتوں سے سینہ بہ سینہ آئے ہوئے نسخوں پر عمل کر کے شاہی ہتھنی کے بطن سے
بادل پایا تھا۔ ہائے وہ کیسا غمزدہ دن تھا جسے بادل کی پیدائش کی خوشی نے

قلعی کر دیا تھا۔ سیتاپور کے انگریز سول سرجن نے تفصیلی طبی معائنہ کر کے حکم لگا دیا تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے اہل نہیں ہیں اور وہ جوانی میں بوڑھے ہو کر کمر پر ہاتھ رکھے ٹہل رہے تھے کہ بڑے فیل بان نے جنگل سے آکر خبر دی اور وہ فوراً سوار ہو کر پہنچے اور اس "زچہ اور بچہ" کے لانے کا بندوبست کیا۔ جس نے پالتو ہاتھی کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ پھر ۔ ۔ ۔ پھر بادل کو پالا گیا۔ بادل جو چودھری اکبر علی کا بیٹا تھا۔ چہرولی کا رئیس زادہ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی خوش قامتی اور نیک اطواری کی دھوم مچ گئی وہ محمود آباد راج کی "بٹلر پیاری" کو جس کی اودھ میں نظیر نہ تھی دیکھ کر حقارت سے مسکرا دیا کرتے۔ ہاتھی کے مقابلے پر ہتھنی کو سدھانا بہت آسان ہوتا ہے۔ پھر بھی بادل بٹلر پیاری سے کسی بات میں کم نہ تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی باتوں میں آگے تھا۔ لیکن چونکہ "بادل" ایک چھوٹے سے رئیس کے پاس تھا اس لیے اسے وہ شہرت نہ مل سکی جس کا وہ حقدار تھا۔ پھر وہ اس جوڑے کا نام یاد کرتے کرتے تھک گئے جس نے بادل کو خریدنے کی حسرت نہ کی تھی پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی نے زینو کو جنم دیا اور خود مر گئی۔ شاید ڈاکٹروں سے یہ شرط جیتنے کے لئے وہ زندہ تھی۔ زینو کی معصوم کلکاریاں اور بھولی باتیں تک بادل کی محبت کا سودا نہ کر سکیں۔ جب زینو جوان ہوئی تو انھوں نے غور سے دیکھا کہ اس کا رنگ کالا ہے ہاتھ پیر سوکھے ہوئے اور آنکھیں چندھی ہیں یہ دیکھ کر وہ اداس ہو جاتے لیکن نئی نویلی دولہن یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھاتی کہ زینو کیسی بھی سہی آپ کی

بیٹی ہے جھرولی کی وارث ہے اور جھرولی کی وارث کے لیے رشتے زمین سے اگیں گے اور آسمان سے برسیں گے لیکن ہوا یہ کہ پیغام درجنوں آئے لیکن بس آکر رہ گئے بارش کے انتظار میں ان کا ایک ایک خواب سوکھ گیا۔ ایک ایک خیال سوکھ گیا پھر معلوم نہیں کس نیکی کے بدلے میں لشکر پور کے رئیس کا پیغام آیا وہ نہال ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کے ذہن کے دلدّر دھل گئے۔ حالانکہ ان کے دل کے چور نے اس وقت تک انھیں قرار نہ لینے دیا۔ جب تک نکاح نہ ہو گیا۔ اور اب سب کچھ ہو کر یہ قیامت کھڑی ہو گئی۔ کاش۔ جے راج سنگھ پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی کو ہٹا کر خیمے کے اندر آ گئے اور اٹھتے ہوئے چودھری کا شانہ دبا کر لٹا دیا۔ خود پٹی پر ٹک کر ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگر آہ ازیں روتی ہیں تو روتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا بارات واپس چلی جائے؟"

چودھری نے داہنی آنکھ کا گوشہ پونچھ کر چپکے سے جواب دیا۔

"بارات میری لڑکی کو بیاہنے نہیں آئی تھی۔ بارات ہاتھی بیاہنے آئی تھی اور ہاتھی بیاہے نہیں جاتے۔"

تھوڑی دیر بعد جے راج سنگھ اٹھے اور خیمے کے دروازے پر کھڑے ہوئے جگاواں کے بڑے بھیّا کو ساتھ لے کر بارات کی قیام گاہ پر پہنچے۔ ہاتھی بٹھائے جا رہے تھے۔ گھوڑے کھنچے کھڑے تھے۔ ادّھے جوڑے جا رہے تھے۔ اچھا خاصا

شور تھا لیکن۔ لیکن یہ شور آدمیوں کی آوازوں سے خالی تھا۔ جے راج سنگھ
سیدھے ٹھاکر ریاست علی کے پاس چلے گئے جو ننگے سر، بغیر بدھیوں کے شیروانی پہنے
"بٹلر پیاری" کے پاس ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے جے راج سنگھ کو سلام کیا اور ان
کے پاس جاکر احترام سے جھکے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ پھر دھیرج سے بولے۔
"مکونی اور لشکر پور ایک تھا۔۔۔۔ تمھیں معلوم ہے؟"

"جی"

"۱۸۲۳ء میں تمھارے پردادا جو میرے دادا کے بڑے بھائی تھے مسلمان
ہو گئے تھے پھر بالا پور راج کی لڑکی سے شادی کی اور لشکر پور آباد کیا۔ "لشکر شکن"
تمھارے پردادا کے ہاتھی کا نام تھا۔ اسی کے نام پر گڑھ آباد ہوا۔ پھر مکونی سے لشکر پور
چھٹ گیا۔ تمھاری ہڈی اور تمھارا خون میری ہڈی اور میرا خون ہے"

"جی"

"ہمارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بہو کا ڈولا چھوڑ کر بارات اٹھا
لی جائے"

"لیکن آج ہوگا"

"بُرا ہوگا بیٹا۔۔۔ بہت بُرا ہوگا"

"دنیا میں سب اچھا ہی اچھا کہاں ہوتا ہے چاچا جی؟"
پھر مکونی کے ٹھاکر اور جگا داں کے بڑے بھیا کے دیکھتے ہی دیکھتے "بٹلر پیاری"

بٹھادی گئی لشکر پور کے ٹھاکر ریاست علی چاندی کے ہودج میں سوار ہوگئے، سینکڑوں اد ھیوں پر مشتمل بارات دھول کے بادل اڑاتی لشکر پور والی سڑک پر غائب ہوگئی۔ ننگی بدنصیب فینس پیچھے پیچھے رینگ رہی تھی۔

جہاں آئینے جھوٹ بولتے ہوں اور اپنے آپ میں ہمت نہ پاتے ہوں کہ کبھی زینت آرا بیگم سے سچ بول کر اقرار کرلیں کہ وہ بدصورت ہے وہاں بھوکی ننگی عورتوں کے منھ میں ایسی لمبی زبان کہاں سے آئے جو سچ بولے اور بھوک سے بلبلا کر مرجائے، اور عریانی سے شرما کر گر جائے۔ ماں کے مرتے ہی چودھری اکبر علی نے زینت آرا بیگم کو باپ ہی بن کو نہیں ماں بن کر بھی پالا۔ جب دوسری شادی کی تو حسین اور کمسن دولھن کی خواب گاہ میں داخل ہو کر جو پہلی گفتگو کی وہ زینت آرا بیگم کے متعلق تھی اور آپا جان نے جو زینت آرا بیگم سے عمر میں کچھ ایسی زیادہ بڑی نہ تھیں، اپنے رشتے کا وہ بھرم رکھا کہ دور دور تک ان کی مثال دی جاتی۔ وہ ارمان اور حوصلے، وہ چاؤ اور چونچلے جو صرف ان ماؤں کا مقدر ہوتے ہیں جو آسینوں پر دل ٹانکے پھرا کرتی ہیں۔ زینو کی شادی میں آپا جان نے وہ تمام کے تمام برتے اور بڑی دانش مندی سے اپنے چکرا تے ہوئے سر کو سنبھال کر کوشش کی کہ زینو۔ یہ بری خبر نہ سن سکے۔ لیکن بری خبریں زبانوں کی بیساکھیاں لگا کر نہیں چلتیں۔ نقارۂ خدا بن کر بجتی ہیں۔ اکلوتی، لاڈلی، ضدی، لاڈلی بیٹی کے کانوں میں جب یہ گولی لگی تو وہ اپنی انا کی گود میں ڈھے گئی۔ جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ سینکڑوں خاموش

زبانیں اور بولتی ہوئی آنکھیں ترس کھا رہی ہیں بھاری جوڑا اسے ڈسنے لگا اور زیور

کاٹنے لگے۔ اپنے بدن سے اٹھتی ہوئی اُبٹن، پھولوں اور سہاگ کی خوشبو سے گھن

آنے لگی وہ چوٹ کی گرمی میں اٹھی اور سیدھی حمام میں گھس گئی۔ خوب مل مل کر

نہائی اور کنوارا پنے کے سیدھے سادے کپڑے پہن کر اسی سیجنی میں پڑ رہی جہاں اُن

کا ماتھا باندھا گیا تھا۔

نہ مہرولی میں وبا پھوٹی تھی نہ مہمانوں کے گھروں سے کسی ناگہانی کی خبریں آئی

تھیں۔ لیکن شادی میں شرکت کے لئے آنے والا ایک ایک آدمی بغیر کسی تمہید و

دیباچے کے رخصت ہو گیا۔ چودھری اکبر علی نے اپنی آنکھ کے شامیانے سے لے کر

تنور کے گڑھے تک ایک ایک چیز جو جہاں سے آئی تھی وہاں پہنچا دی۔ رخصت

ہونے والے کنبوں کے ایک ایک دودھ پیتے بچے تک کا حساب کر کے ناشتے اور

کھانے کا بندوبست کیا اور کیسے کیسے کڑے وقت آئے لیکن وہ ہر بار اپنی مغرور

آنکھوں کو رسوائی میں ڈوبنے سے بچا لائے۔

ساون چڑھنے لگا تھا "ہتھیا نحست" لگ گیا تھا۔ گلیاروں میں نہریں بہہ

رہی تھیں۔ کھیت تالاب ہو گئے تھے، پرنالوں اور نالیوں کے ذریعہ آئی ہوئی مچھلیاں
آنگنوں اور چھتوں پر چمک رہی تھیں: لڑکے گھر بیٹھے فنکار کھیل رہے تھے۔ زندگی
ظالم زندگی جو ماضی کو یاد نہیں کرتی اور مستقبل کا اندیشہ نہیں رکھتی ہردولی کے ان آدمیوں
پر مسلط ہو چکی تھی جو چودھری کی بٹیا کے غم میں اونگھ رہے تھے۔ درختوں میں جھولے
پڑنے لگے تھے۔ سڑکوں پر پتاور کے پٹاخے دغنے لگے تھے۔ چوپایوں میں "آلھا"
گایا جانے لگا تھا۔ ہر طرف ساون ہی ساون نظر آتا تھا۔ وہ دن پوری برسات
بھری برسات کا دلارا دن تھا۔ آسمان پر ہاتھی لڑ رہے تھے۔ گرج رہے تھے۔
برس رہے تھے۔ سیاہ منقش ستونوں پر رکھے ہوئے بھاری چھپر کے نیچے تخت پر سوزنی
پڑی تھی۔ کیسیلے گاؤ تکئے سے لگے ہردولی کے چودھری بیٹھے تھے۔ سامنے صحن میں بادل کھڑا
تھا۔ سونڈ نچا نچا کر آوازیں نکال نکال کر برسات کا جشن دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا
اس کے موٹے، مخروطی سفید دانتوں کے سروں پر پیتل کے چھلے ڈھل کر اور چکنے لگے
تھے۔ چودھری جلتے ہوئے حقے کو گڑ گڑائے جا رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح گھر کے بڑے
دوہرے دالان میں پتاور کا جھولا ڈال کر آدمی نکل آئے تھے اور ڈیوڑھی میں بیٹھے
بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ بھگوان دین حلوائی گرم گرم اندرسوں کا تھال اندر بھجوا کر
تھال کے انتظار میں دالان کی زمین پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ چودھری نے گھوم کر
دیوان خانے کے دالان کو دیکھا جس کے پکے فرش پر خدمت گار بیٹھے کھسر پھسر کر رہے
تھے۔ پھر دو آدمی اٹھ کر آئے اور ان کے چھپر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ کھڑے

رہے جس دن بارات آئی تھی اس دن سے وہ اپنے گھر کے اندر نہیں گئے تھے باہر ہی کھاتے۔ باہر ہی سوتے، باہر ہی رہتے، انھوں نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ روز صبح غفورے نائی حجامت بنانے آتا۔ گھنٹوں "کسبت" لئے بیٹھا رہتا۔ پھر چلا جاتا۔ سفید داڑھی اور مونچھوں سے چہرہ بھر گیا۔ ناک سے بال جھانکنے لگے تھے۔ کرتے کی آستینوں اور گلے پر میل جم گیا تھا۔ پائجامے کے گھٹنوں پر دھبے پڑ گئے تھے۔ منشی مختار صرف ان کو "اہلکار نے" کے لیے جائداد کے انتظام میں مشورے کرنے آتے۔ لمبی چوڑی تفصیلوں کے ساتھ بات کو تنگڑ بنا کر پیش کرتے۔ آخر چپ ہو جاتے اور چپ چاپ اٹھ جاتے۔ چودھری اسی طرح خاصدان سے کھیلا کرتے۔ حقہ گڑگڑایا کرتے۔ بادل کی خوش فعلیاں دیکھا کرتے۔ آج وہ اٹھے اور جوتے پہنے ہوئے چل پڑے۔ ایک سپاہی نے لپک کر چھتری کھولی اور ان پر تان کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پھر چونک پڑا۔ بادل نے سونڈ سے پکڑ کر چھتری چھین لی تھی۔ وہ ڈیوڑھی تک اسی طرح سونڈ سے چھتری پکڑے پکڑے ان کو پہنچا گیا اس کے بعد بھیگتی ہوئی چھتری کو چھپر کے تخت کی سوزنی پر ڈال کر اپنے فیل خانے کی طرف چلا گیا۔ چودھری جو بادل کی چھتری ہی میں کافی بھیگ چکے تھے۔ اندر کا صحن پار کرتے کرتے اور بھیگ گئے۔ عورتیں جو ادھر ادھر کام کاج میں بکھری ہوئی تھیں ان کو دیکھ کر دیکھتی ہی رہ گئیں۔ سامنے کے دالان میں زینو کھڑے تخت پر بیٹھی وضو کر رہی تھی۔ باپ کو دیکھ کر بچانے کے لیے اٹھی لیکن بدحواس ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ چودھری نے

سوتی سفید کپڑوں کے کفن میں لپٹی ہوئی نیم مردہ بیٹی کو دیکھا تو لڑکھڑا گئے۔ چاہا کہ اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیں لیکن خون اچھل پڑا۔ بوڑھے ہاتھوں نے زینو کو لپیٹ لیا۔ زینو جو بھری کھڑی تھی چھلک اٹھی۔ دونوں باپ بیٹی پیٹے ہوئے روتے رہے انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ بہت کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نہ ملے۔ آواز نہ نکلی جب زینو کی انّا زینو کو ان کی باہوں سے نکال لے گئی تب وہ کمرے کے پلنگ پر گر پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد نظر اٹھائی۔ سامنے تخت کے کونے پر بانس کے سرپوش سے ڈھکی ہوئی اندرسوں کی سینی رکھی تھی۔ گاؤ تکیے کے برابر مرادآبادی پاندان کے پاس وہ لہریا چنری تہہ کی ہوئی پڑی تھی جو ہر سال ساون میں زینو کے لئے آیا کرتی تھی۔ دالان میں بناؤ کا جھولا خالی پڑا تھا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر ہاتھوں سے زور کر کے اٹھے۔ ان کے بھیگے ہاتھ پر زینو کی آپا نے ہاتھ رکھ دیا اور آنکھوں سے کہا کہ پانی برس رہا ہے بھیگتے ہوئے کہاں جائیے گا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر باہر چلے گئے۔

اپنے باپ کے بھیگے ہوئے کپڑوں سے بھیگی ہوئی زینو نے جیسے تیسے نماز پڑھی اور اپنی اس صحنچی میں چلی گئی جس میں وہ مانجھے بٹھائی گئی تھی۔ آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ اس کے ابا میاں بوڑھے ہو گئے۔ اتنے بوڑھے ہو گئے کہ...... کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اس نے اپنی سونی کلائی منھ میں گھسیڑ لی۔

اس نے دیکھا اور سنا عورتیں کہہ رہی تھیں، بارات کی واپسی کی خبر نے تہلکہ ڈال دیا تھا۔ آپا جان جہیز کے کمرے کے دروازے پر کھڑی فہرست دیکھ رہی تھیں۔ سنتے ہی چکرا گئیں لیکن انتہائی دور اندیشی اور تحمل سے سنبھل کر اندر چلی گئیں وہ اپنی نادن بوا کی گود میں ڈھے گئیں عورتیں جو روتے بچوں کو کوٹھو پر جڑے گودیں دبائے دیگوں پر بھنک رہی تھیں اس خبر سے سنّا کر رہ گئیں۔ خون میں رینگتی ہوئی جھوٹی شرم سے مجبور ہو کر اپنے روتے بچوں کی پیٹھوں پر دھمکے لگاتی ہوئی اٹھ آئیں۔ بدنیت بچوں کے دکھ پر کراھتی ہوئی کونوں میں چھپ چھپ کر بربرانے لگیں۔

"قسمت قسمت کی بات ہے ...... اور قسمت نورانی بٹیا خاص اللہ میاں کے ہاتھ سے لکھ کر لائی ہیں ...... ماسیے کو تو آتے ہی ڈس لیا اور اب باپ پر پھن کاڑھے بیٹھی ہیں۔"

"سچ کہا ... ہا ... راج پاٹ کیا نہیں دیا چودھری کو اللہ نے ... بس بٹیا کے کارن خوشی نہ دی۔"

"خیر بٹیا کا کیا بگڑتا ہے بی بی! ... کوئی نہ کوئی اللہ کا بھیجا آ ہی مرے گا۔ کا ہے سے کہ جو پیدا ہوا ہے وہ جوڑا لے کر پیدا ہوا ہے ... ہاں ان بوڑھے میاں کے سفید مونہہ پہ کالک لگنا بدی تھی سو لگ گئی۔"

"اے سنو ... کا زینو بٹیا بے ہوش ہوئے گئیں ہیں؟"

"بے ہوش ؟"

" ہنھ - ایسا حیا کی بیٹی نا ہیں ہیں تمھری زینو ۔ بٹیا - جو اتتے پانی ماں مر جائیں ان کا تو ہاتھی ڈباؤ چہیے - ہاتھی ڈباؤ "

" ہاتھی بچار اتو اپنا سفید منھ لیے بیٹھا آٹھ آٹھ آنسو روئے رہا ہے ... ڈوبے ماں کتنی دیر ہے ! "

" کے آخر ای بٹیا کو شادی کی آفت آئی ہے . . . . الاّ قسم بالکل ہجڑہ معلوم ہوت ہیں ہیجڑہ "

بڑی دیر تک گھٹے ہوئے قہقہے بیچ بیچ کرتے رہے -

" کہت تو یا سلمیٰ ٹھیک ہے - رہی طبیعت کی خوشی کی بات تو اتنے لاٹ ایسے نوکر گھومت ہیں چاہے جی کا بلائے کے سلائے لیو "

" ارے سلمیٰ "

" ہاں "

" غوث پور والا حال سُنے رہو "

" ارے وا فرشتہ رہے فرشتہ "

" کون "

" وہی غوث پور والی بٹیا " . . . برات آئی ۔ دولھا " دوارہ چار " کو کسی براتی کی بندوق دغ گئی "

"ہائے ہائے۔"

"ہاں باجی... اور دولہا اسی جگہ پر مر گیا۔"

"توبہ توبہ... اللہ بری گھڑی سے بچادے... پھر؟"

"پھر کیا! لڑکی کا نکاح تک نہیں ہوا تھا مگر وہ ایسی حیادار نکلی کہ رات ہی میں کچھ کھا کر سو رہی۔"

"کچھ کھا کر سو رہی۔"

"کچھ کھا کر سو رہی۔"

یہ جملہ ایک پناہ گاہ بن گیا۔ عمر بھر کی محرومی اور بدنامی کے چیختے ہوئے سناٹے سے بھرے ہوئے سنسان بیابان میں جب پازیب بھر کے پتھروں کا پتھراؤ ہونے لگا اور سر پر مڑے ہوئے ہاتھوں کی ٹوپی زخمی ہوگئی تو ایک کمسن، معصوم، خود پرست اور مغرور روح بھاگی اور اس پناہ گاہ میں سر چھپا کر پڑی رہی۔ بچپن میں سنی ہوئی ستی عورتوں کی کہانیاں، مقدس کہانیاں ڈھارس اور تسکین کی میٹھی دھنیں بجاتی ہوئی اس کے ذہن پر چڑھ آئیں۔ پھر اس کے آپے میں اس صلابت نے جنم لیا جو پہاڑ سے ٹکرا جاتی ہے جس کے بوتے پر گیلی مٹی کے کمزور پتلے موت پر ٹھٹھ لگاتے ہیں اور جان دے کر زندگی کو سوارت کر دیتے ہیں۔ اس چارہ گر خیال سے جب زینو کی بیقراری کو کچھ قرار آنے لگا تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں میٹھی ہوئی سوچ نے منہ اٹھایا اور بولی کہ حرام موت مر دگی زینو؟ یہ زندگی رو کر گزاری ہے اور وہ زندگی پھونک کر

گزار وگی؟ گزار پاؤگی اور آگ کے عفریتوں کے کھلے ہوئے بھیانک دہانے دیکھ کر وہ کانپنے لگی اور ان سے بچنے کے لئے بہانے تراشنے لگی کہ صحیحی کے سامنے سے ایک بوڑھا جاتا ہوا نظر آیا۔ اس کا چھریرا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آگے نکلی ہوئی توند بری لگتی ہوئی توند چپاتی ہو گئی تھی۔ جھریوں بھری کھال نے کلائی کی ہڈی کو چھوڑ دیا تھا اس کے کرتے میں سوراخ اور پائجامے میں پھونکیں تھیں۔ اس کے پیروں میں بجتی ہوئی کھڑاؤں کی کھونٹیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ زردی مائل سفید بالوں سے سر اور رخسار اور ٹھڈی اور اوپری لب سپید ہے ہوئے تھے وہ کمر جھکائے دونوں ہاتھوں سے المونیم کے بدشکل لوٹے کو سنبھالے چلا جا رہا تھا۔ کسی نے اس کے کان میں کہا "یہ تمہارے باپ ہیں" "میرے باپ؟" "ہاں تمہارے باپ! انھوں نے تمہاری رسوائی کا انتقام لینے کی کوشش کی تھی انہوں نے سارے لشکر پور کو پھونک دینے کے جتن کئے تھے۔ اب مقدمہ لڑتے لڑتے ان گتوں کو پہنچ گئے ہیں اور اس کی شفیق حسین جوان ماں۔ ایک باورچی خانے، اجنبی باورچی خانے کے سامنے جھوا بھر ڈھیر برتنوں کے بیچ میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے اور کسی کمرے سے حکومت جتلاتی ہوئی آواز کسی دوسری انتظار کرتی ہوئی خدمت کے لئے پکار رہی ہے اس نے پورے ہوش وحواس کی تندرستی کے ساتھ محسوس کیا کہ آواز پر ایک گنہگار منصوبے کی پرچھائیں تھرتھرا رہی ہے اس مرتبہ اپنی پناہ گاہ میں جاتی ہوئی زیتون قربانی کے نشے میں سرشار تھی۔ اپنے مقدس مفرور باپ کی آن پر نچھاور ہو جانے کا احساس، خون میں آگ لگا دینے والا احساس

اس کے لیے نیا تھا۔ تند و تیز شراب کا پہلا پیالہ پینے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا اور وہ سر سے پاؤں تک دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

جب پانی تھم گیا اور مغرب کی اذان کو تھوڑی دیر گزر گئی اور آپا جان سارے وظیفے پڑھ چکیں تب دالان میں بیٹھی ہوئی عورتیں کھڑی ہو گئیں انھوں نے بھونے ہوئے میدے اور گھی اور شکر کے چھوٹے چھوٹے پیڑوں اور خربوزے کے برابر برابر گلگلوں کی دوریاں اٹھا لیں۔ موم بتیوں اور اگر بتیوں کے ڈبے سنبھال لئے اور لوبان دانوں اور چراغ دانوں کو روشن کر لیا۔ گھر میں زینو کے ساتھ زینو کی انّا کو چھوڑ کر آپا جان ڈیوڑھی میں لگی ہوئی فنیس پر سوار ہو گئیں۔ عورتوں کی لین ڈوری ان کی فنیس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ جب زینو کو یقین ہو گیا کہ آپا جان چھوٹے شاہ کی درگاہ کا آدھا راستہ طے کر چکی ہوں گی۔ تب وہ اٹھی۔ بوڑھی انّا کو اپنی پلنگڑی پر گرم مڑائے ہوئے دیکھ کر لہراتی ہوئی اس کمرے کی طرف چلی گئی۔ جہاں اس کے صندوق ٹھنسے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ازار بند میں بندھی ہوئی کنجی سے وہ جہازی صندوق کھولا جس میں دو کنڈیاں لگی تھیں اور ہر کنڈی میں ایک ایک جیدّ قفل لٹک رہا تھا۔ اپنے نکاح کا جوڑا نکال کر مٹھیوں میں دبوچ لیا۔ پھر اس میں منھ ڈھانپے بیٹھی رہی۔ قریب تھا کہ رو دے۔ چیخ مار کر رو دے کہ اس کی مٹھیوں میں بھچا

ہوا زرکار اطلسیں جوڑا اچھٹ پڑا۔ چیخ مار کر رو دیا۔ دوپٹے کی ساری زمین میں جڑے ہوئے چمکدار آنسو یہاں سے وہاں تک بکھر گئے۔ وہ جوڑے کو زمین پر پھینک کر کھڑی ہو گئی آنسوؤں کو روک کر اپنی چیخ پر قابو پالیا۔ اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اپنے روئیں روئیں میں سانس لیتی ہوئی ستی ہو جانے والی عورتوں کی استقامت اور دھیرج کو سنبھالا اور کھڑے کھڑے سوچا کہ اس کی امّاں کی افیون ٹین کے بکس میں رکھی ہے یا اس کے سرہانے پڑی ہوئی کپڑے کی تلے دانی میں۔

چودھری جو سچ مچ ان تھوڑے سے دنوں میں بوڑھے ہو گئے تھے ۔۔۔ اپنے دیوان خانے کے چوکے پر پڑے خلا میں گھور رہے تھے۔ دھمکتے ہوئے قدموں میں کھنکتے ہوئے بچھوؤں کی "چھُن مُن" نے ان کی سوچتی ہوئی اجڑی ہوئی نظروں کو ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر بٹھا لیا۔ ان کے ایک ہرواہے کی بہو، اور دوسرے ہرواہے کی بیوی سر پر گنّوں کا بھاری بوجھ فیل خانے کی طرف جا رہی تھی اس کے پیچھے پیچھے سات آٹھ برس کا لڑکا لنگوٹی باندھے ہاتھوں میں گلٹ کے کڑے پہنے کندھے پر چھوٹی سی لاٹھی رکھے چلا جا رہا تھا۔ جوان جہان بھلوا اپنی مضبوط اور آسودہ ٹانگوں پر مفلس اور مطمئن جوانی کا خوبصورت بوجھ اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ کسی نے چودھری کے کان میں کہا۔ مہرولی کے چودھری کی اکلوتی بیٹی سے یہ چمارن کہیں خوش نصیب ہے۔

اس خیال کے کلبلاتے ہی ان کے سامنے خیالوں کا نگار خانہ کھل گیا۔ ان کے خاندان کی تاریخ.... سنہریں تاریخ کے ورق.... چاندی کے ورق ان کی آنکھوں کے سامنے جگمگانے لگے۔ انھوں نے اپنی دکھی آنکھوں کو گڑ گڑ کر ساری عبارت کو پڑھ لیا لیکن ایک واقعہ بھی ایسا نہ ملا جہاں ان کے خاندان نے اپنی آبرو کا سودا کیا ہو۔ انھوں نے یہ تو دیکھا کہ ان کے کسی بزرگ کو توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ کسی فرد نے اپنی جوانی کے بہترین سال جنگلوں میں اچھلتے ہوئے زخمی گھوڑے کی پیٹھ پر نیزہ ہلاتے ہلاتے گزار دیے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے چھوٹی سی مادّی خوشی کے لئے.... چھوٹی سی مادی خوشی کو خریدنے کے لئے اپنی روایات کے انمول خزانے کو لٹا دیا ہو۔ ان کی گردن نے کروٹ بدلی۔ گڑگڑاتی ہوئی آواز قطرہ قطرہ ان کی سماعت پر گرنے لگی۔

"کل رات پھول پور کے کٹھار میں بھیڑیا گھس آیا اور پانچ سرکاری بکریاں کاٹ دیں۔"

"ہردلی کے چودہری تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ روایات زندگی کرنے کے سلیقے کو آداب سکھلاتی ہیں۔ زندگی بخشتی ہیں اور کڑے وقتوں میں صبر عطا کرتی ہیں۔"

"پہرے پر جو آدمی تھا اس کا بیان ہے کہ پچھلی رات دیوار کا ایک حصہ بارش میں کٹ گیا تھا اور دیوار چھوٹی ہو گئی تھی اس لیے بھیڑیا...."

روایات پر انسانی زندگیاں بھینٹ نہیں چڑھائی جاتیں۔ زندگیاں آم اور

جامن کی فصلیں نہیں ہوتیں، گیہوں اور دھان کا بیارہ نہیں ہوتیں۔"

"آسانی سے کٹھار میں اتر گیا۔ میں نے اس کی بات کی تصدیق کے لئے پھول پور کے سیر بانوں اور اسامیوں کو طلب کر لیا ہے ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا بیان صحیح ہے۔"

"جنھیں سڑ جانے دیا جائے .... جنھیں گھن جانے دیا جائے۔ زندگی ایک بار صرف ایک بار ملتی ہے اور پھر اولاد؟ اور کیسی اولاد؟ ایسی اولاد جس نے تمھارے گھر میں پیدا ہو کر تمھیں مرد کی سب سے بڑی مسرت سب سے بڑی کامرانی سے آشنا کیا۔"

"بادل بھیّا" کے راتب کے لئے جو چک بویا گیا تھا اس میں اسمال کھاد کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔"

"زینو نے تمھاری سب سے بڑی تشنگی کو آسودہ کیا ہے ... تمھاری زندگی کے سب سے بڑے خلا کو پُر کیا ہے۔"

میں نے پڑنا پور والوں کو تاکید کر دی ہے کہ وہ اسی ہفتہ پورے چک کو پانس دیں ..... کیونکہ چک کوئی پچیس بیگھے کا ہے اس لئے۔"

تو اگر تم بنیوں ہی کی طرح دوکانداری کرو تو بھی زینو کئی "بادلوں" پر بھاری ہے۔ کئی "بادلوں" سے مہنگی ہے۔

"عبادت سے کہو "بادل" کھینچے۔"

"حضور ؟"

"مجھے کوئی جانا ہے"

"مگر ..... بوندیں پڑ رہی ہیں"

"چھتری لگالوں گا"

عصر کی نماز کے بعد جب کہ ابھی عورتیں کڑھائی پر بیٹھی تھیں اور آپا جان درگاہ پر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مہرولی کے چودھری تیار ہو کر دیوان خانے سے نکل آئے۔ چبوترے کے سامنے بادل کھڑا تھا۔ سیاہ منقش کپڑا پہنے جھل بن دکھلا رہا تھا۔ چودھری کو دیکھ کر اس نے ہمیشہ کی طرح خوشی کے اظہار میں آواز نکالی اور سونڈ کو ماتھے پر رکھ کر سلام کیا اور اگلے پاؤں موڑ کر جھک گیا۔ کان پھیلا دیئے۔ سونڈ لہرا دی۔ فیل بان کٹھرے کے کونے میں ہو گیا کیونکہ چودھری ہمیشہ اسی طرح کان پکڑ کر، سونڈ پر پاؤں رکھ کر چڑھا کرتے تھے لیکن آج بارش ہو رہی تھی اس لئے کٹھرے کے بائیں طرف سن کے رسوں کی سیڑھی جھول رہی تھی۔ چودھری کمر پر ہاتھ باندھے خاموش کھڑے بادل کو دیکھ رہے تھے ان نظروں سے دیکھ رہے تھے جن نظروں سے حکمراں باپ اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر دشمن کے حوالے کرنے سے پہلے دیکھا کرتے تھے۔ وہ دیکھتے رہے۔ بادل اگلے پیروں پر جھکے جھکے تھک گیا۔ پھر اس کی تکلیف کا خیال کر کے

چودھری سیڑھی کی طرف بڑھے لیکن سیڑھی کو پکڑ کر چھوڑ دیا۔ اور گردن کے اشارے سے بادل کو جھکنے کا حکم دیا۔ بادل کے نرم کان پکڑے سونڈ پر پاؤں رکھا اور سوار ہو گئے۔ چودھری کافی دنوں بعد بادل پر سوار ہوئے تھے اس لیے وہ جھوم جھوم کر چل رہا تھا۔ کیچڑ اور پانی سے بھری ہوئی سڑک پر سنبھل سنبھل کر سبک سبک پاؤں رکھتا ہوا چل رہا تھا اور چودھری کچھ سوچ رہے تھے۔

دور حدِ نگاہ تک کھیتوں میں خریف کے ہرے دوشالے سوکھ رہے تھے باغ ابھی ابھی نہا کر نکلے تھے ان کے ہرے جسموں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈوں پر موج اڑاتے ہوئے نوجوان کسان ساون کی تانیں لگا رہے تھے۔ سارا موسم چہک رہا تھا۔ ساری فضا کھنک رہی تھی مگر چودھری اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

چودھری جب کوٹھی سے نکلے تو رات چڑھنے لگی تھی۔ ساون کے بادلوں اور رنڈی کے وعدوں کا کیا بھروسہ! بادل صاف ہو گئے تھے۔ برسات کا دھلا ہوا آسمان.... ستاروں بھرا آسمان جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ کے اونچے شیشم کی پھنگی پر چاند ٹکا ہوا تھا۔ ساری زمین چاندنی سے چھلک رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کروندے کی جھاڑیاں ہزاروں لاتعداد جگنوؤں

کے چراغ جلائے دیوالی منا رہی تھیں لیکن چودھری بادل کے کھرڑے میں بیٹھے اپنے آپ سے الجھ رہے تھے۔ اپنے دل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے اندھیرے قافلے کے کوچ کے خواب دیکھنا چاہتے تھے لیکن بےقراری دیکھنے نہ دیتی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے وہ ایک منظر کی دوکان لگاتے اور آن کی آن میں ذہن کے کسی کونے سے کوئی پاگل بھینسا نکلتا اور شیشے کی دوکان چور چور ہو جاتی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ نفس کو جو لڑائی ہار چکا تھا بہلا رہے تھے اور سمجھا رہے تھے۔ پھر ولی کے نانکے پر خبر ملی۔ وہ گرتے پڑتے اندر پہنچے۔ زینو نے افیون کھا کر کڑوا تیل پی لیا تھا۔ نکاح کے اترے ہوئے جوڑے کے پاس وہ خود بھی بکھری پڑی تھی۔

سب سے پہلے ملکوٹی خبر بھیجی گئی کہ ٹھاکر کہیں آناً فاناً لشکر پور جا کر ہارات کی تیاری کا بندوبست نہ شروع کر دیں۔ لیکن چودھری کا بھرم کھل گیا تھا۔ خبروں کے جنگلی پرندے غول کے غول اڑتے پھر رہے تھے چٹ پٹی کہانیوں کی عاشق زبانوں میں پر لگ گئے تھے۔ کانوں کے پیٹ بھر گئے تھے۔

۲۵ اگست ۱۹۴۲ء کا نم اور گرم دن تھا۔ جب تک پانی برستا رہتا سکون

رہتا اور جہاں پانی تھا کہ آگ لگی۔ بہرولی کے چودھری سشن کورٹ سیتاپور کے سامنے املیوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے ٹہلتے رہے اور قاضی حبیب اشرف بار ایٹ لا سے نہر کے معاملے پر گفتگو کر رہے تھے کہ انقلاب کے نعروں سے عدالت کی عمارت ہلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں بھگدڑ مچ گئی۔ رائفل کی آواز سن کر وہ بھی قاضی صاحب کے ساتھ عدالت کے اندر پہنچنے کے لئے تقریباً دوڑے۔ لیکن فوراً ہی قلابازی کھا کر رہ گئے۔ گولی سینے پر لگی تھی اور پیٹھ سے نکل گئی تھی۔ اندولن کرنے والے جیالے انقلابیوں کے ساتھ ایک کڑھا ہوا رچا ہوا کٹر زمیندار مرا پڑا تھا۔ سیتاپور سے بہرولی تک کے کچے خراب راستے کو بادل نے تیزی کے ساتھ طے کیا۔ پہروں کی منزل گھڑیوں میں لپیٹ کر ڈال دی۔ بہرولی میں کہرام مچ گیا۔ شیخ کی لاش کو دیکھ کر سارا علاقہ ہلنے لگا۔ زینو کی آپا پر قیامت آ گئی۔

لشکر پور کا دیوان خانہ سورج کی روشنی کی سنہری خاک میں اٹا پڑا تھا۔ پیش دالان کے پردے بندھے ہوئے تھے۔ بغلی دالان میں چوکے پر چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کے دو لڑکے گاؤ تکیوں سے لگے بے نیازی سے بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب موذبانہ انداز میں "رفتن" کی گردان کرنے کی گزارش کر رہے تھے۔ وہ رحلوں پر کھلے ہوئے آمدنامہ کی سطروں سے بہت دور صحن کے اس پار ان مینڈھوں کو دیکھ

رہے تھے جو ایک دوسرے کے سامنے زنجیروں میں بندھے ہوئے پھڑپھڑا رہے تھے اور
بھینسیں باندھنے والی زنجیریں ان کے توڑے نہ ٹوٹتی تھیں۔ چوکے کے پلنگ کے پاس زمین پر
بچھی ہوئی موٹی چٹائی پر ایک آدمی بوتل کے پیندے سے تختی گھوٹ رہا تھا۔ اسکے پاس ایک تختی
گھوٹی ہوئی چمکتی ہوئی تختی پڑی تھی۔ دوسرا آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا کلک کا قلم بنا رہا تھا۔ چاقو میں پڑی
ہوئی زنجیر جھنجھنا رہی تھی۔ مٹی کی دواتیں گلے تک گھری رکھی تھیں۔ دوات کی کچھ چھینٹیں لڑکوں کے سفید
کرتوں کے دامنوں اور آستینوں پر چمک رہی تھیں دیوانخانے کے صحن کے بائیں طرف نیم کے بھاری درخت

کے پیچھے بنے ہوئے فیل خانے سے ہاتھی نظر آ رہا تھا۔ نیم کے نیچے کھجور کے تنوں کے
شہتیروں پر نازک سا چھپر رکھا تھا۔ جس کا پھوس نیا ہونے کی وجہ سے تیز بھورے
رنگ کا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ چھپر کے آڑے شہتیر میں پنکھا جھول رہا تھا۔
چل رہا تھا۔ چارپائی کے برابر لمبی آرام کرسی پر رسو بھیا پڑے تھے۔ ان کے پاؤں
سامنے کے تخت پر بچھے تھے۔ سانولے سلونے چہرے پر جڑی ہوئی سیاہ مونچھیں
کھڑی ہوئی سیاہ مونچھیں اپنی تنک مزاجی کہیں رکھ کر بھول گئی تھیں اور اب
یاد کر رہی تھیں سیاہ آنکھیں سوچنے کی عادت سے آشنا معلوم ہونے لگی تھیں۔
ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی برسوں کی آرزوؤں کا خواب۔ بادل کھڑا تھا۔
بادل کی ملکیت کی زنجیر چودھری کے مضبوط ہاتھوں کے بجائے اس نازک ہاتھ میں
تھی جس کی انگلیاں مہندی سے نہا اور کلائی چوڑیوں سے ناخوش تھی۔ پھر ان کے
زانو پر ایک لانبی موٹی سیاہ معطر چوٹی رینگنے لگی۔ ان کے نتھنے ایک جسم کی خوشبو سے

بھر گئے۔ سامنے دالان کی دہلیز پر مہرولی سے شیخ کے سوئم کی اطلاع لانے والا آدمی بیٹھا ہوا چلم پی رہا تھا۔ ٹھاکر ریاست علی عرف رسّو بھیّا اٹھے اور بل جوت کر آئے ہوئے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سن کر چونکے آدمیوں سے کھیتوں کے متعلق کچھ باتیں کیں اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ پھر گھڑی گھڑی بھر کے بعد اندر سے پیام آنے لگے جب وہ اندر اماں کے سامنے پہنچے تو اپنی آنکھوں سے تیرتا ہوا منصوبہ نکال کر کہیں احتیاط سے رکھ چکے تھے۔ اماں ریشمی چوڑی دار پائجامہ، سفید ململ کا کرتا پہنے سر سے دوپٹہ اوڑھے پاندان کھولے کھرّے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ بڑے بھیّا کو دیکھتے ہی آڑے ہاتھوں لیا۔

"بیوی مریں تم مہندی لگائے بیٹھے رہے۔ سسر مرے تم نے سنی ان سنی کر دی.... لو کا اندھیر ہے بھیا ...... موت زندگی میں جنم جنم کی لڑائیاں بھلا دی جاتی ہیں۔ اگر تم سیّم (سوئم) کے فاتحے میں بھی شریک نہ ہوئے تو میں خود سوار ہو جاؤں، چاہے تم خفا ہو چاہے خوش۔"

رسّو بھیّا جھکے ہوئے پاندان کی تھالی سے دوہرے اٹھا اٹھا کر کھٹکتے رہے اور سنتے رہے۔ پھر اماں کو تقریر کرتا چھوڑ کر چلے آئے۔

مہرولی میں کچھ ایسا بھیڑ بھڑکا نہیں تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ اس ناگہانی کے بعد کسے اتنا ہوش ہے کہ وہ اہتمام کرے پھر ابھی سارے فاتحے باقی ہی تھے۔ ادھر ادھر کے کچھ لوگ گھوڑی سواری آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد فاتحہ ہوتے ہی آدمی چھٹنے لگے تھے۔ بچے کھچے عصر کی نماز پڑھ کر چلے گئے۔ مہرولی کی عورتیں زینو کی آپا

کو گھیرے دالان میں فرش پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ دو ایک ٹوٹی پھوٹی عزیز دار بیویاں بھی ٹوں ٹاں کیے جا رہی تھیں۔ چراغ جلتے جلتے باہر سے خبر آئی کہ لشکر پور کے بڑے بھیّا آئے ہیں۔ آپا جو اس آواز کا انتظار کرتے کرتے بوڑھی ہوئی جا رہی تھیں چونک پڑیں۔ پھر بد حواس ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔ کیا کریں۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ عورتوں اور ملازموں نے ان کی خاموشی کے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق معانی پہنا لیے۔ پھر عشا کی نماز کے بعد اندرونی صحن میں چاندنی لگ گئی۔ بستر بچھ گئے۔ تب لشکر پور کے بڑے بھیّا اندر بلائے گئے۔ آپا نے دیکھا وہ ٹیڑھے ٹیڑھے آئے اور سلام کر کے کھڑے ہو گئے آپا نے بھیگی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"بیٹھو۔"

وہ ایک بستر کی پائنتی تک گئے۔ آپا تھوڑی دیر تک اسی طرح ہتھیلیوں میں چہرہ لیے بیٹھی رہیں۔ پھر پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جو ان جہان رسّو بھیا بچوں کی معصومیت چہرے پر لپیٹے بیٹھے تھے۔

"زینو مر گئی ...... تم نہیں آئے۔ باپ مر گئے ..... تم .... تم .... نہیں آئے .... سیّم (سوئم) کے فاتحے تک میں شریک نہ ہوئے۔"

"میں .... میں .... ڈرتا تھا۔ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ـــ اس لئے۔"

"سلوک کرنے والے تو اٹھ گئے۔ میں رانڈ بیوہ۔"

وہ رونے لگیں۔

"خود ہی دوسروں کا منھ دیکھنے کو بیٹھی ہوں۔"

"ہا..... معلوم نہیں کس گھڑی تم نے سہرا باندھا تھا..... معلوم نہیں کون وقت موا بادل پیدا ہوا تھا کہ میرا گھر اجاڑ کر رکھ دیا..... بنا بنایا گھر اجاڑ کر رکھ۔"

وہ پھر رونے لگیں۔

روتی رہیں۔

"آپا..... چپ ہو جائیے..... آپا..... نہیں تو میں چلا جاؤں گا۔"

"ہاں..... جن کا عمر بھر کا ساتھ تھا وہی چھوڑ کر چلے گئے تو تم کو کیا۔"

ایک عورت آکر کھڑی ہو گئی۔

"بھیا ابھیں کھانا نائیں کھائین ہیں۔"

"کے بھیا؟"

"جی ہاں..... بھوک نہیں تھی۔"

"ان کا کھانا یہیں لگا دو..... اور ساتھ میں جو آدمی جن ہوں ان کا بھی خیال کر لو۔"

"میں جانا چاہتا ہوں..... اماں انتظار کرتی ہوں گی۔"

"اس وقت؟"

"ہاں۔"

"نہیں..... صبح جانا۔"

اس رات آپا کو نیند نہ آئی۔

آپا ضلع ہردوئی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے غریب زمیندار کی آٹھویں بیٹی تھیں۔ ہمسنوں، ہمجولیوں نے چودھری کی عمر کا ذکر کر کے ٹھنڈی سانسیں بھری تھیں اور وہ خود بھی کچھ چپ چاپ سی رہنے لگی تھیں۔ لیکن جب بیاہ کر آئیں اور ڈولا بھر سونا لاد کر جگمگاتے کپڑوں سے بھرے ہوئے صندوقوں کے تالے کھولے تو انھیں احساس ہوا کہ وہ دوبارہ پیدا ہوئی ہیں اور بڑی دھوم دھام سے پیدا ہوئی ہیں۔ چودھری کی زندگی بھر وہ اپنے آپ کو یقین دلائے بیٹھی رہیں کہ وہ چودھری سے محبت کرتی ہیں اس لیے کہ انھوں نے آنکھ کھول کر سنا تھا کہ شریف بیویاں اپنے شوہروں سے محبت ہی کرتی ہیں اور ماں باپ سے جہیز میں شرافت کے علاوہ انھیں کچھ بھی نہ ملا تھا۔ حویلی کے اتنے بڑے کارخانے پر ان کا حکم اسی لیے تو چلتا تھا کہ وہ چودھری کی بیوی تھیں اس خیال نے بھی انھیں محبت کا چسکہ دیا تھا۔ لیکن جب چودھری دفن ہو گئے اور حویلی ان کی مٹھی میں آ گئی اور دولھا بنتے ہوئے رسّو بھیا کی تیکھی تیکھی نظروں کی کھٹک یاد آئی تو وہ پہلی بار 'اجنبی' لذت انگیز درد سے تلملا اٹھیں۔ جب یہ درد ان کے سراپے کو دبوچ کر بیٹھ جاتا تو وہ کراہنے لگتیں۔ پھر کسی درد سے ایک گول مٹول لڑکا کھکھلاتا ہوا بیاں گھسیٹتا ہوا آتا اور دھپ سے ان کے پیٹ پر بیٹھ جاتا اور ان کے گریبان میں گدگدیاں ہونے لگتیں۔ اس منزل پر وہ اٹھیں۔ وضو کیا۔ نفلیں پڑھیں اور خدا سے دعا مانگی کہ ان کی شرافت بدنام نہ ہونے پائے۔ یہ سب جتن کر کے بھی جب بستر پر آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ سامنے تخت پر رسّو بھیا سہرہ

باندھے بیٹھے ہیں اور گھوڑے چلے جا رہے ہیں انھوں نے کروٹ بدل لی اور سورہ یٰسین پڑھنے لگیں۔

چودھری تو کچے مکان میں رہتے تھے لیکن بادل کے لیے بھٹہ پھنکوا کر ٹینک بنوایا تھا جس میں نہر کا پانی کاٹ دیا جاتا اور بادل کھیلتا رہتا۔ چودھری کے مرنے کے دن سے بادل اداس ہو گیا تھا اور راتب چھوڑ دیا تھا۔ عبادت جب بہت چمکارتا پچکارتا تو دس بیس گنے کھا لیتا۔ اس لیے کہ گنوں کا کوئی وقت نہ تھا اور راتب چودھری اپنے سامنے بلکہ اپنے ہاتھ سے دیتے تھے اپنے پختہ فیل خانے کے سامنے دھلے ہوئے فرش پر وہ کھڑا تھا۔ عبادت نے اس کے سامنے چھلے ہوئے گنوں کا ڈھیر لگا دیا تھا لیکن وہ متوجہ نہ ہوا تھا۔ رسّو بھیّا دیوان خانے کے چبوترے پر ٹہل رہے تھے۔ مسواک کر رہے تھے اور بادل کی چھب دیکھ رہے تھے ان کا جی تو چاہتا تھا کہ اسی وقت کٹھرہ کسوا کر سوار ہو جائیں لیکن خودداری تھامے ہوئے تھی۔ مسواک ختم ہو گئی لیکن وہ دیکھتے رہے پھر جب وہ ناشتہ کرنے اندر آ گئے تو ڈیوڑھی پر چودھری کے پرانے کارندوں کو آپا سے گفتگو کرتے پایا اور جب ناشتہ کے لیے تخت پر بیٹھے تو ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے ان کو سلام کیا وہ پرانی دھوتی اور نیا کرتا پہنے ہوئے تھا اس کے چہرے پر دیہاتیوں کی بیوقوفانہ سادگی برس رہی تھی آپا نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ ان کا چچا زاد

بھائی ہے اور پرُسے میں آیا ہے جب ناشتہ کر کے وہ چچازاد بھائی بھاڑو کی سینگ
سے خلال کرتا ہوا باہر چلا گیا تب آپا نے اسے خبر دی کہ چودھری کے کسی عزیز نے جائداد پر
اپنا حق جتلایا ہے اور عدالت کی دھمکی دی ہے۔ میں عورت ذات کھیت پات ہی کی مصیبت
بھوگنے کے لائق نہیں ہوں تو کچہری عدالت کا بھرنا کیسے بھروں گی۔ چاروں طرف آنکھیں
بھاڑ بھاڑ کے دیکھتی ہوں مگر کوئی آدمی کا پتلا ایسا نظر نہیں آتا جس پر بیٹیے بیاہے کا
بھروسہ کروں تو بھلا سونے چاندی اور گاؤں گراؤں کا کیا ذکر۔ رہ گئے تم۔ تو تم پر بھیا اس
گھر کا حق ہے یہ بگڑے گا تو تم بھی ہنسے جاؤگے اور بنے گا تو تمہاری بھی تعریف کی جائے
گی اور جو ٹالنے کے لیے تم لشکر پور کا حوالہ دو تو بھیا سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ خدا تم کو
لاکھوں برس کی عمر دے اور قیامت کا دیکھنا نصیب کرے تمہارا نام لشکر پور کا انتظام
کرتا رہے گا۔ لیکن جہرولی کی گاڑی نہیں چلے گی جب تک تم ہاتھ نہیں بٹاؤگے جب
تک تم کام نہیں سنبھالوگے جو میرے اپنے عزیز ہیں ان کا کہنا ہی کیا۔ اول تو غریبی
نے ان کو ہم سے دور کر دیا۔ پھر وہ اپنی غریبی اور ہماری امیری کی وجہ سے دور بھی ہوتے
گئے اور عداوت بھی باندھتے گئے ابا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھائی کوئی پھوٹے نصیبوں
کو جڑا ہی نہیں۔

وہ پھر رونے لگیں۔

رسّو بھیا بڑی مشکل سے بولے کہ آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں اور یہ کہہ کر
انھوں نے آپا کو دیکھا سیاہ ریشمی چوڑی دار پائجامہ سے ان کی تندرست پنڈلیاں

پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ پیر اور سفید ہو گئے تھے۔ سفید دوپٹے کی سوگواری نے ان کی خوبصورتی کو اور جان لیوا بنا دیا تھا۔ رسّو بھیا نے نظریں جھکائیں۔ آپا نے ماہرِ نفسیات کی آنکھ سے موقع کی نزاکت کو دیکھا اور گرم لوہے پر چوٹ کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"تم بسوان چلو میں رجسٹری کر دوں۔"

"کاہے کی؟"

"مختاری کی"...... میں تم کو اپنا مختارِ عام بنا دوں گی۔ ان ٹکر گدوں نے سمجھا کیا ہے۔ سامنے آتے آتے پنڈلیاں کانپنے لگیں گی۔"

رسّو بھیا چپ چاپ سنتے رہے یہ سب کچھ ان کے منصوبے میں شامل نہیں تھا لیکن وہ سنتے چلے گئے یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب دروازے پر فینس لگ گئی اور لشکر پور کے ہاتھی نے کہرہ پہن لیا اور آپا اپنا برقعہ پہن کر کھڑی ہو گئیں جس کی ٹوپی ان کے سر پر مڈھی ہوئی تھی اور نقاب کی جالی سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رسّو بھیا بھی جیسے تیسے اپنے ہاتھی پر سوار ہو گئے۔ راستے بھر وہ اس بادل کے متعلق سوچتے رہے جس نے راتب چھوڑ دیا تھا اور کسی کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیتا تھا۔

بسوان تحصیل کے احاطے میں فینس رکھ دی گئی۔ مرحوم چودھری کے کارندوں نے فینس کو گھیر لیا۔ رسّو بھیا اہلکاروں کے نرغے میں گھر گئے۔ ظہر کی نماز ہونے ہوتے سارے

"مسودے" بن گئے۔ جاہل آپا نے ہر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے جسے رسّو بھیا نے ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ لالہ شہزاد بخش جو چودھری کے مختار تھے۔ فینس کی بلّی بچّے کھڑے تھے۔ اپنی بوڑھی تجربہ کار آنکھوں سے ایک ایک مسودے کے ایک ایک حرف کو پرکھ چکے تھے اور مطمئن تھے مگر جب پردے کے پیچھے سے آنے والے کاغذات میں سے ایک کاغذ نکل کر رسّو بھیا کی جیب کی طرف چلا تو وہ چونکے لیکن بہر حال وہ نوکر تھے اور رسّو بھیا داماد۔ جب تک رسّو بھیّا ہاتھی پر سوار نہ ہو گئے۔ اور فینس کہاروں کے کندھوں پر چڑھ نہ گئی۔ لالہ شہزاد بخش رسّو بھیا کے پیچھے لگے رہے۔

وہ رات بڑی تیکھی رات تھی، بڑی بانکی رات تھی۔ آسمان بے انتہا صاف تھا۔ تارے کچھ نیچے آ گئے تھے۔ چاند نے اپنی ایک ایک کرن پر قلعی کی تھی اور خود بھی نہا دھو کر نکلا تھا۔ آپا شاید یہ بھول گئی تھیں کہ ابھی مرنے والے کو مرے ہوئے اتنے دن بھی نہیں گزرے جتنے دن میں دھوبی کپڑے لاتا ہے۔ اسی لیے خوش تھیں۔ آج پلنگ کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بدلے گئے تھے۔ دلوں پر چھائے ہوئے بادل کھل گئے تھے۔ آنکھیں انہیں دور تک دیکھنے لگی تھیں۔ آپا نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کی پہلی قسط پوری ہو گئی تھی اب وہ دوسری چال چلنے کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ لیکن طے نہ کر پاتی تھیں۔ یہاں تک کہ رات جو انسان کی زندگی کے منصوبوں سے کہیں چھوٹی ہوتی ہے ختم ہو گئی

اور پہلی بار آپا کو احساس ہوا کہ اچھے کھانے اچھے کپڑے ڈرائیور فرنیچر اور ڈھیر بھر نوکروں
کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ نام ہوتے ہیں جن سے وہ ناآشنا تھیں۔ جن سے وہ آشنا
ہوئی ہیں انھوں نے اپنے خوابوں کو تہہ کر کے اپنی آنکھوں میں رکھ لیا۔ اپنی تعبیر اپنے
دل کے کسی کونے میں ڈال لی اور خواب میں چلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں
راستے میں نیچی سی منڈوہی چوکی پر ان کے وضو کا لوٹا اپنی ایک آبدیدہ آنکھ سے ان کو
گھورتا رہا۔ پھر وہ اونچے پایوں کی چوکی پر مخملیں جانماز نیم دراز سی پڑی رہی اور ان کے
خوشبودار جسم کی لذت کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ لانبے چوڑے باورچی خانے کی دہلیز
پر بچھی ہوئی تکیے دار نواڑی پیڑھی پر آ کر بیٹھ گئیں اور تھکی ہوئی نڈھال آواز میں
ناشتہ پکانے والی عورتوں کو احکام دینے لگیں۔ ابھی وہ چوکی پر منہ دھونے کے لیے پہنچی ہی
تھیں کہ رسّو بھیا اندر آگئے اور آدھے آنگن سے اونچی آواز میں خبر دی کہ وہ لشکر پور جا
رہے ہیں۔ وہ چوکی سے اتر کر ان کے پاس آئیں اور بڑی لگاوٹ سے سبب پوچھا۔ رسّو
بھیا نے ہنسی شرما کر ڈھیٹ ہو جانے والی ادا سے جواب دیا۔ وہ مطمئن ہوگئیں۔ جیسے ہی
ناشتہ کر کے رسّو بھیا باہر نکلے اور بادل کے فیل بان کو حکم دیا کہ بادل کو کھینچا جائے۔
نوکر کی قوم بڑی ذہین قوم ہوتی ہے۔ ہوا کا رخ پہچاننے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔
فیل بانوں نے مل کر بڑے جتن کے ساتھ بادل کو چلنے پر اکسایا۔ کٹہرے کے بجائے
اس کی پیٹھ پر گدا باندھا گیا اور رسّو بھیا دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں سے سوار ہو گئے۔
سیاہ سلوتر ٹانگوں کے ستونوں پر چوڑی چکلی پشت کے چبوترے پر گدا لگا تھا۔ قالین

بچھا تھا۔ رسّو بھیا جوٹ کے بھاری تکیے پر کہنی گاڑے نیم دراز تھے تخت رواں پر اڑے چلے جا رہے تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد کالے خاں فیل بان رسّو بھیّا کے سامنے آیا۔ ہاتھ جوڑ کر گزارش کی کہ وہ بادل کو گھر لے جا رہا ہے۔ بھیّا نے غضب کی نگاہ سے فیل بان کو دیکھا اور حکم دیا کہ بادل اسی گھر میں رہے گا۔ یہی اس کا گھر ہے۔ ویسے خود وہ اپنے گھر جا سکتا ہے۔ کالے خاں منھ کھولے آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھتا رہا۔ پھر بادل کی سمت جانے لگا تو کندھے پر بلّم چمکاتے ہوئے سپاہیوں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور دہلی جانے والی سڑک پر ایک لات مار کر چھوڑ دیا۔ فیل بان نے جاتے ہی جاتے لالہ شہزاد بخش کو کتھا سنائی لالہ نے تقسیم کی ہوئی آدھی داڑھی کو ہتھیلیوں سے سہلایا۔ بڑی گمبھیرتا سے ایک ایک بات کے دس دس پہلوؤں پر غور کیا۔ پھر ڈیوڑھی پر پہنچے۔ بوڑھی مگر وفادار عقل جو کچھ اور جہاں تک دیکھ سکی وہ آپا کو دکھلاتی رہی لیکن آپا پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ہاں ایک خط انہوں نے لکھوا کر فوراً آدمی کے حوالے کیا اور تاکید کی کہ خاص بھیا کے ہاتھ میں دینا۔ اتنا کر کے وہ پھر اپنے اس دیس میں لوٹ گئیں جس میں چودھری کے بڑھاپے کے علاوہ سب کچھ تھا۔

لشکر پور کے فیل خانے میں بادل نے چارہ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے سامنے چھلے

ہوئے گنّے اور بنائے ہوئے ڈھلے ہوئے چارے کے بوجھ رکھے گئے، لیکن وہ متوجہ نہ ہوا۔ بھیّا اسی فکر میں تھے کہ جھرولی کے پاسی نے دستی خط لاکر دیا۔ انھوں نے جھنجھلا کر لکھنے والے کا نام پڑھا اور موڑ کر جیب میں ڈال لیا جب بادل پر کوئی داؤں نہ چلا اور فیل بان ہار گئے تب ٹھاکر ریاست علی عرف رسّو بھیا نے ٹھکرائی شروع کی۔ حکم ہوا کہ چاروں پیروں میں زنجیریں ڈال دی جائیں اور کانٹے دار زنجیروں میں جتنے کانٹے ہوتے ہیں اس سے زیادہ کانٹے ڈالے جائیں۔ بادل کے چاروں پیر زخمی ہوگئے۔ سونڈ پر بالشت بالشت بھر کے گڑھے ہوگئے، لیکن بقول فیل بانوں کے "پانی" نہیں مرا۔ جب تین دن اسی طرح گذر گئے تب فیل بانوں نے مالک کے حکم سے بھوکے کمزور بادل کے بلّیوں اور آنکھوں سے اتنی مرمت کی کہ وہ بیٹھ گیا اور سر ڈال دیا۔ آخر کار تیسرے دن بادل نے راتب کھایا۔ سیر ہوکر چارہ کھایا۔ دوسرے دن لشکر پور کے فیل بانوں نے نہلانے پر رضامند کرلیا۔ چوتھے دن وہ چارہ کاٹنے کے لیے نکلا۔ جب اس طرح بھی تین چار دن گذر گئے اور رسّو بھیا کے لیے ضبط ناقابل برداشت ہوگیا تب بڑے اہتمام سے فیل بانوں نے کٹھرہ باندھنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ کٹھرہ باندھنے پر جب بادل بلوہ کرے گا تب "گدیلا" کس دیں گے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ خود بادل کٹھرے کی رسّی کسنے میں مدد دے رہا ہے اور بیٹھ کو جھٹکا دے کر کٹھرے کو جما رہا ہے جب کٹھرہ بندھ گیا تب جنگل خاں نے جس کے گھر میں سات پشتوں سے فیل بانی ہوتی آئی ہے اور جو سات برس کی عمر سے لشکر پور کے ہاتھیوں

پر نوکر تھا۔ کمر باندھی سر پر مر بیٹھا کسا اور وہ آنکس لے کر کھڑا ہو گیا جس میں گھنگھرو بندھے
ہوئے تھے۔ جنگل خاں نے آواز لگائی۔ بادل نے گھٹنوں پر جھک کر کان پیش کر دیئے
جنگل خاں کٹھرے پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر تک صحن میں چکر کھلاتا رہا جب ہر طرح کا
اطمینان ہو گیا تب اس نے کٹھرے میں بندھی سیڑھی کی رسّی کھول دی۔ اور بیتاب رسّو
بھیا کو سے مودّبانہ اشارہ کیا۔ وہ چڑھ گئے۔ بیٹھتے بیٹھتے جنگل خاں نے " ددگا ما
ہانک دیا۔ بوڑھے جنگل خاں کو ہانکنے میں جو لطف آرہا تھا وہ رسّو بھیا کے نشۂ ملکیت
سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بادل کے زخم ابھی پوجے نہ تھے اور کمزوری بھی پوری طرح رفع
نہ ہوئی تھی اس لیے جھرولی جانے والی سڑک پر دو میل چل کر جنگل خاں نے بادل کو
پھیرنا چاہا۔ لیکن بادل اتنی دور چل کر گرما چکا تھا صاف انکار کر گیا۔ جنگل خاں کے
پاس استادی کے جتنے ہاتھ تھے سب نکال لیے لیکن بادل اسی طرح اڑا رہا۔ اور ٹھاٹھ
سے ددگا ما چلتا رہا۔ بوڑھا جنگل خاں جو مالک کے عشق کی بنا پر بادل سے جلتا تھا بھڑک
اٹھا اور کٹھرے میں جھولتی ہوئی چھوٹی سی کلہاڑی کھینچ کر چار چھ ہاتھ جھاڑ دیئے بادل
خالی ہاتھ ہوتا تو پی جاتا لیکن وہ جھرولی کا لاڈلا وارث بھی رہ چکا تھا اور شاید اسی
گھڑی کے لیے راتب اور چارے کی قبولیت کا سوانگ بھر رہا تھا۔ بادل پہلے سڑک
پر بے تحاشا بھاگا پھر اچانک پر سکوڑ کر جھٹکا دیا کچھ رسّے ٹوٹ گئے جو بچ گئے تھے
انھیں سونڈ سے کٹھرہ کھینچ کر توڑ دیا۔ پھر کبوتروں کے کابک کو زمین پر ٹپک دیا سب
سے پہلے نظر جنگل خان پر پڑی۔ ان کو ٹانگوں سے پکڑ کر سونڈ میں لپیٹ لیا اور جھرولی

کے فیل خانے پر جنگل خاں کے نیچے کھچے جسم کے سونڈ سے چپٹے ہوئے حصے جھاڑ دیئے۔
پھر اپنے "حمام" میں داخل ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں دھونے لگا۔

جب رسّو بھیا کو ہوش آیا تو وہ سیتا پور کے سول ہاسپٹل میں پڑے تھے ان کی بائیں ٹانگ کولھے سے نیچے تک پلاسٹر میں قید تھی اور جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں صرف داہنا ہاتھ تھا جو بے داغ رہ گیا تھا۔ ان کے چہرے سے نگاہ اٹھی تو آپا کی آنکھوں سے سیاہ گہری، بولتی آنکھوں سے الجھ گئی۔

مہینوں کے علاج کے بعد سول سرجن نے مایوس ہو کر کورا جواب دے دیا۔
لشکر پور کے ٹھاکر ریاست علی سارے دن اور ساری رات، گاؤ تکیے سے پشت لگائے خلا میں گھورتے رہے اس قسم کا رونا روتے رہے جس میں آنسو نہیں نکلتے جس میں آوازیں نہیں نکلتیں۔ بوڑھی اماں نے کانپتا ہاتھ ان کی پیٹھ پر رکھا اور ہلتا ہوا سر ان کے سر پر ڈال دیا اور اپنے آنسوؤں سے ان کی پیشانی بھگو دی۔ پھر گھڑی بھر میں انتظام کر کے لکھنؤ میڈیکل کالج کے ایک پرائیویٹ وارڈ کو آباد کر دیا۔

بے داغ قلعی کیا ہوا سفید کمرہ، سفید کپڑوں میں ملبوس اماں، ڈاکٹر اور نرسیں

دواؤں کی شیشیوں کے انبار، انجکشنوں کی امید کو قوت دینے والی تکلیف، مضبوط اور بے حس ہاتھوں کا مساج، تیمارداروں اور عیادت کرنے والوں کے سفید چہرے میلی سوچتی ہوئی آنکھیں، بے یقین تھکے ہوئے، کمزور قدم، دھیمے لہجوں دعا مانگتی ہوئی، دعا دیتی ہوئی مایوس امیدیں، لنگڑاتے ہوئے بیزار دن، اور بیساکھیوں پر گھسٹتی ہوئی بیدار راتیں۔ سب نے اپنی سعی کرلی۔ لیکن زمانے کے بعد جب بے سّو بھیا لشکر پور آئے تو ٹھنڈی چنکبری بیساکھی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے آئے۔ صفّو بھیا اور مّنو بھیا کے کسی حد تک بے ادب سلاموں اور سوالوں کے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیئے پھر ڈیوڑھی پر لگی ہوئی فنیس پر سوار ہوکر قبرستان گئے۔ اس ماں کی تازی قبر پر فاتحہ پڑھا جو ان کے علاج کے لیے روپیہ بٹورنے آئی تھی لیکن طاعون نے دھکے دے کر یہاں پہنچا دیا تھا۔ واپسی پر ڈیوڑھی کے سامنے جب وہ فنیس سے اترے تو نگاہ مسکرا دی۔ سامنے بادل کھڑا تھا۔ سبک ٹانگیں، کسا ہوا پیٹ، چوڑی چکلی پشت مکھیاں اڑاتی ہوئی جھالردار دُم، نکیلے دانت، لہراتی ہوئی بے چین سونڈ سب کچھ وہی تھا۔ وہ دیر تک بیساکھی کے سہارے کھڑے رہے، دیکھتے رہے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے۔ جب رات کو وہ اندر پہنچے تو سر سے اوڑھے ہوئے چُنے ہوئے جنگل بائی کے دوپٹے کے پلو سے سفید سونی کلائی باہر نکلی اور ان کی پیٹھ پر ٹھہر گئی۔ انھوں نے آپا کے نیسلے ہاتھ کو اٹھا کر تخت کے فرش پر رکھ دیا۔ آپا سیتاپور کی دیوانی سے مقدمہ جیت گئی تھیں۔ لیکن بھیّا۔ لنگڑے بھیا کے منھ سے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے ٹھہر لی

سے چل کر آئی تھیں۔ وہ بیٹھی رہیں۔ ان کی عدالتِ عالیہ ببیا کھی کے سہارے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور مسہری پر لیٹ کر کمبل میں لپٹ کر حقّہ پینے لگی۔ رشّو بھیا بادوں کی تھیلی کھولے ان دنوں کے روپہلے سکّے بجا بجا کر دیکھتے رہے تھے۔ جب دونوں ٹانگیں تھیں۔ ان پر لکھنؤ کا سلا ہوا وہ چوڑی دار پاجامہ چڑھا ہوا تھا جس میں جالی بنی ہوئی تھی اور بیچے بنے ہوئے تھے اور وہ چوڑیاں برابر کر کے ہاتھی کے کان پکڑ کر سونڈ پر پاؤں گاڑ کر چڑھ جایا کرتے تھے۔

بھیّا کی آنکھوں کی بے نیازی اور ہاتھوں کی بے حسی نے آپا کے کانوں میں صور پھونک دیا۔ جب وہ ہوش میں آئیں تو ننگی حقیقت نے ٹھنڈے لہجے میں ان کو اطلاع دی کہ وہ بیوہ ہو گئی ہیں وہ رات بھر صبح کے ہونے کا انتظار کرتی رہیں مگر صبح کمبخت صبح آ ہی نہ چکتی تھی۔ آخر جب وہ بوڑھی ہونے لگیں تب فجر کی اذان ہوئی اور انھوں نے بستر سے اٹھتے ہی فنیس لگانے کا حکم دیا۔

جب بھیّا کاغذات پڑھ چکے۔ گھر کے حسابات دیکھ چکے اور کارندوں کے بیانات سن چکے تب ان پر اچانک انکشاف ہوا کہ صفّو بھیا اور منّو بھیّا ایک ساتھ جوان

ہو گئے ہیں۔ سولہ سولہ سترہ سترہ برس میں اپنے ہاتھ پیر نکالے ہیں کہ بیس بیس چوبیس برس کے کڑیل جوان شرما جائیں۔ جاگیرداری کے انتظام میں خلل پڑ چکا تھا۔ بھاری بھاری کاشت کار بھیا لوگوں سے رسیدیں لے کر اور جمع دے کر اپنی آبرو بچا چکے تھے آم اور کٹھل کے باغوں کی فصلیں کوڑیوں کے مول بیچی گئی تھیں۔ جنگل اور بازاروں کی آمدنیاں گھٹ گئی تھیں۔ اچھے اچھے جانور بک چکے تھے۔ متفرق درخت کٹ چکے تھے غلے کی لبالب بھری رہنے والی کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی گھر کا جمع جتھا سونا چاندی سب نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ بڑے بھیا ننگڑے بھیا تھوڑی دیر کے لیے اپنی ٹانگ بھول گئے اور بھائیوں کے کھلے ہوئے ہاتھوں اور بھٹکتے ہوئے پیروں کے متعلق سوچنے لگے۔

پھر ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ان گنت تقدیریں تاریخ کے جبر کی غلام ہو گئیں۔ فسادات ہو رہے تھے لیکن سیتا پور کا یہ علاقہ محفوظ تھا۔ بڑے بھیا نہ ہکوتی کے پولنگ اسٹیشن پر ووٹ ڈالنے گئے تھے۔ اور نہ ان فسادات پر غور کرنا پسند کرتے تھے وہ اس انقلاب کو اس قیامت کو بالکل دوسروں کا معاملہ سمجھتے تھے اور ایک ٹانگ کے بوتے پر دوسروں کے معاملے میں پڑنا مناسب نہ خیال فرماتے تھے لیکن جب زمینداری ختم ہوئی تب وہ ٹوٹ گئے۔ چور چور ہو گئے

پھر ایک دن لشکر پور کی گڑھی کے پہریداروں کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے ڈیوڑھی کے بھاری منقش دروازے کے دونوں پٹ کھول کر وہ غریبی گھس آئی جو محبت کو ڈس لیتی ہے اور اعتماد کو کھا جاتی ہے۔ بڑے بھیا بغل میں بیساکھی رکھے پلنگ پر لیٹے حقّہ پی رہے تھے۔ امّاں کی برسی ..... کے فاتحے کے خرچ کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے، بادل کے روٹ، بیلوں کے راتب، نوکروں کی تنخواہیں، مکان کی مرمت سب اپنے اپنے ہاتھ پھیلائے ان کے پلنگ کی پٹی کے سامنے قطار لگائے کھڑے بیٹھے تھے۔ صفّو بھیّا منجھلے بھیّا چھت پر ہاتھوں میں چرخی پکڑے اپنی چاند تارہ تپنگ کا پیٹہ دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ سیتا پور کی ستارہ بائی نے جو جڑاؤ کرن پھول مانگے ہیں ان کا کیا بندوبست کیا جائے اور منّو بھیّا چھوٹے بھیا، چمکیلی دھوپ میں بندوق صاف کر رہے تھے اور ہول رہے تھے کہ پرکاش نرائن کا قرضہ تو ایک ہزار سے گزر چکا ہے اب وہ اور دینے سے رہا۔ اگر اس نے نہ دیا تو کون دے گا اور اگر پرکاش نرائن نے بڑے بھیّا سے کہہ دیا تو؟ ہنہہ۔ کہہ دے کیا کر لیں گے مگر بال دیو پاسی کی دولھن نے کل ہی نیا ریشمی جوڑا جو مانگا ہے۔ وہ؟ اس کا کیا ہو گا؟ کیا ہو گا۔

"بھیا"

"کون؟"

"رام پیارے"

"کیا ہے؟"

"بڑا باغ کٹ رہا ہے"

"بڑا باغ کٹ رہا ہے! کیوں؟"

"منجھلے بھیا بیچ رہے ہیں"

تھوڑی دیر تک طوفان کے منصوبے بنتی ہوئی خاموشی چھائی رہی۔ پھر منجھلے بھیّا بلائے گئے۔ ان کو دیکھتے ہی بڑے بھیا بھول گئے کہ ان کے ایک ہی ٹانگ ہے اور جوتا اتار کر چلے۔ لنگڑاتے ہوئے چلے لیکن ایک ہی دھکّے میں گر پڑے۔ جب آدمیوں نے ان کو اٹھا کر بٹھایا تو ان کو پتہ چلا کہ ایک ٹانگ کے ساتھ ساتھ ان کا اقبال بھی لنگڑا ہو گیا ہے ساری رات وہ پلنگ پر بیٹھے رہے لیٹے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے لشکر پور اور قرب و جوار کے بوڑھے بوڑھے آدمی بلائے گئے۔ زمین اور باغ اور جانور بانٹ دیئے گئے۔ منجھلے بھیا اور چھوٹے بھیّا ایک میں رہے۔ بڑے بھیّا الگ ہو گئے پھر گرہستی بٹنے لگی۔ کوٹھری کے برابر صندوق کی تقسیم نہ ہو سکی تو بڑھئی کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ قد آدم آئینہ جس کا حاشیہ آبنوس کا تھا اور جس پر چاندی کا کام تھا۔ توڑ دیا گیا۔ یہ سب ہونے کے بعد بندوقوں اور ہاتھی کا نمبر آیا۔ بڑی مصیبتوں کے بعد یہ طے پایا کہ اگر چاروں بندوقیں دونوں بھائیوں کو دے دی جائیں تو بادل بڑے بھیا کو مل سکتا ہے بڑے بھیا اس سستے سودے پر رضامند ہو گئے اور دل ہی دل میں دیر تک خدا کا شکر ادا کرتے رہے ایک بزرگ بڑے بھیا کے پاس آئے اور بولے کہ ان کی چاروں بندوقیں اگر چالیس ہزار کی نہیں تو پچیس تیس ہزار کی یقیناً ہیں لیکن بادل کے عاشق بڑے بھیّا ان سے مخاطب تک نہ ہوئے اور کھڑے

کھڑے مکان میں دیواریں کھنچوا دیں۔

یہ سب کچھ کر کے بھی بڑے بھیّا کا دل پورا نہ ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس باہمی بٹوارے پر قانون کی مہر لگ جائے لیکن اس خرچ پر ہونے والے دو ہزار وہ اس وقت، کہاں سے لاتے۔ بھیا لوگ تو ایک دھیلے کے روادار نہ تھے پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ اب ایسا کلجگ نہیں آگیا ہے کہ اس طرح سارے جوار کی آنکھوں میں دھول جھونک دیں۔ لیکن بھیا لوگوں نے سچ مچ دھول ہی جھونک دی۔ بٹوارے کی رات ہی دونوں بھائی جو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور دوسروں کے دماغوں سے سوچتے تھے منصوبہ بنا کر بیٹھ گئے دوسرے دن اپنے دونوں حصّوں کے باغ بیچ دیئے اور زمین کے دام کھڑے کر لیے۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی خاموشی سے ہوا کہ جب زمین پر خریداروں نے قبضہ کر لیا اور باغوں میں کلہاڑیاں بجنے لگیں آرے چلنے لگے اور لکڑی ڈھونے کے لیے آئے ہوئے ٹرک، گرجنے لگے تب بات کھلی۔ بڑے بھیّا نے بہت ادھم مچایا۔ لیکن زبانی۔ اس لیے کہ بھیّا لوگ بندوقیں چھتیائے پھرتے تھے۔ عدالتوں کی طرف دیکھا تو کل کرسیاں بچھانے والے حکام آج آنکھیں نہ ملاتے تھے۔ بھائی برادری کو جمع کیا تو انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ہم بھائی بھائی کے معاملے میں کیا بولیں۔ ہماری کیا مجال کہ ہم کسی پر حکم احکام نافذ کریں۔ بھیّا لوگ ان کے تہاڑے حصّے میں پھر شریک ہو گئے۔

پھر ۱۹۵۷ء میں پنچایت کا الکشن ہوا۔ بھیا لوگوں نے لنگڑے بھیّا (بھیا لوگوں نے بڑے بھیّا کو لنگڑے بھیا بنا دیا تھا) کے مقابلے میں ایک جلاہے کو کھڑا کر دیا اور لنگڑے بھیا ہار گئے۔ لشکر پور کا پردھان ایک جلاہا ہو گیا۔ پھر بھیا لوگ بندوقوں سے لے کر گھر کے دروازوں تک ایک ایک چیز بیچ کر پاکستان چلے گئے۔ تب لنگڑے بھیّا نے سکون کا سانس لیا۔ بچی بچی زمینوں کو پرکھا۔ ان پر محنت کی اور یہ سوچ کر خوش ہوئے کہ اگر فصل اچھی ہو گئی تو حالت سنبھل جائے گی۔ دل کے چور نے ارشاد کیا کہ اگر بادل کا خرچ نہ ہوتا تو زندگی بہت آسان ہوتی۔ نفس نے تڑ سے جواب دیا کہ اگر بادل نہ ہوتا تو بیوی ہوتی، بچے ہوتے اور پھر نہ معلوم کیا حشر ہوتا۔

بھیا لوگ اپنے حصّے کا مکان بیچ گئے تھے۔ لنگڑے بھیا نے اپنے حصّے کا بھی ایک حصّہ اس لیے چھوڑ دیا کہ تنہائی رہے اور انسان نما جانوروں سے دوری نصیب ہو۔ انھوں نے اپنا دروازہ سڑک کی طرف موڑ لیا تھا۔ زنانے مکان کے دوہرے دالان اور کمرے نخانہ بن گئے تھے۔ تمام ممکن توجہ کے باوجود مکان کھنڈر نظر آتا تھا۔ دیواروں کو دق ہو گئی تھی۔ چھتیں چھلنی ہو گئی تھیں ہر برسات ایک آدھ حصّہ اپنے ساتھ بہا لے جاتی اور لنگڑے بھیا سمٹتے چلے جاتے۔

لنگڑے بھیا کے سامنے صحن میں سوکھے کنڈا جوتوں کی قطار لگی تھی۔ ماہی پشت

کے پایوں کے کھبلانگ پر چوڑی دار پائجاموں، پرجیوں، کوٹوں اور ٹائیوں کا ڈھیر لگا تھا۔
اس کے مقابل دوہرے دالان کے دوسرے سرے پر تخت تھا جس کی ایک ٹوٹی ہوئی
ٹانگ کو پختہ اینٹوں کی بیاکھی سنبھالے ہوئے تھی۔ تخت پر پرانے لحاف گدّے اور تکیے
الجھے پڑے تھے۔ صحن کے کونے میں گلِ عبّاس کی جھاڑیوں کے پاس وہ مینڈھا بندھا
تھا جس کا اون کاٹ لیا گیا تھا جس کے مڑے ہوئے موٹے موٹے سینگوں پر سیاہی چمک
رہی تھی۔ چبوترے پر بقاتی چلم پھونک رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رام رتن
جوگرے ہوئے کمرے سے چھوٹا موٹا سامان کھینچ کھینچ کر نکال رہا تھا انگوچھے سے ہاتھ پیر دل
کی مٹّی جھاڑتا ہوا باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد تحصیل بسواں کے نائب تحصیل دار پنڈت رام پرکاش
کے ساتھ اندر آیا۔ پنڈت رام پرکاش نے دور ہی سے آداب عرض کیا۔ بقاتی نے ایک
پرانی کرسی بھیّا کے سامنے بچھا کر چلم حقّے پر جما دی۔ پنڈت نے کرسی پر بیٹھ کر بہت اطمینان
سے باتیں کیں۔ پھر بھیّا کی نظروں سے نظریں چرا کر دبی ہوئی دکھی آواز میں کہا۔

"ایک بُری خبر ہے بڑے بھیّا"

بڑے بھیّا بولے نہیں۔ ان کی مجبور آنکھیں اور مجبور ہو کر پنڈت کے چہرے پر
گڑ گئیں۔ ان کا نیلا، سانولا اور دُبلا ہاتھ بیاکھی کے ڈنڈے کو سہلانے لگا۔

"۴۹ئہ میں آپ نے پختہ کنوئیں کے لیے جو تین ہزار کا سامان لیا تھا اس کی ڈگری۔"

"میں نے سامان لیا تھا پنڈت جی۔"

بھیّا تقریباً چیخ پڑے وہ اپنے اوپر گرنے بڑھتے ہوئے پہاڑ کو اونچی آواز سے روکنا

چاہتے تھے۔

"جی ہاں اس پر آپ کے دستخط موجود ہیں۔ منجھلے بھیا اور چھوٹے بھیا نے ہی تو سامان کی وصولیابی کی تھی۔"

بڑے بھیا اس جملے سے کچل گئے۔

"میں نے اور دوسرے اہل کاروں نے تحصیلدار سے بڑی پیروی کی ورنہ وہ تو جرمانہ اور سود لگا کر کوئی پانچ ہزار بنانے والے تھے۔"

بڑے بھیا کے شانے جھول گئے۔ دونوں کہنیاں تکیے میں دھنس گئیں۔ گردن داہنے شانے کی طرف لٹک گئی۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ قسطیں ہو جائیں لیکن ڈپٹی صاحب مانے نہیں۔"

"بڑے بھیا کے سانولے چہرے پر زردی پھیلنے لگی۔"

"ہر طرف سے مجبور ہو کر آخری داؤں میں نے یہ پھینکا کہ وصولیابی کے لیے کچھ موقع مل جائے لیکن "صاحب" اس پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ کل صبح وہ وارنٹ لے کر آئیں گے.... میں کل ہی آتا لیکن کل صبح تک نراش نہیں ہوا تھا۔"

ذرا دیر چپ رہنے کے بعد پنڈت نے بڑے بھیا کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر مردنی اپنے منحوس پر پھیلائے ہوئے لیٹی تھی۔ انھوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ذرا سا اٹھے۔ لیکن پھر اخلاقاً بیٹھ گئے۔

"نائب صاحب کے لیے کچھ شربت پانی لاؤ بھائی۔"

بڑے بھیاّ نے ڈوبی ہوئی آواز میں رام رتن کو حکم دیا۔

پنڈت رام پرکاش شربت پانی پی کر چلے گئے۔ رام رتن نے ایک ایک چیز نکال کر رکھ دی۔ بقاتی نے جوتوں کی قطار اور کپڑوں کا گٹھر کمرے میں پہنچا دیا۔ اور تخت پر دو دستر خوان لگا کر کھانا چن دیا جس کی زرد زمین کے حاشیے پر اشعار چھپے ہوئے تھے۔ تانچینی کے ہر وَش پلیٹیں اپنی ہتھیلیوں پر کھانے سجائے بیٹھی رہیں۔ بیٹھے بیٹھے سوکھ گئیں۔ نوکر جانورو کا چارہ دانہ کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ چلم پیتے پیتے رام رتن کو کھانسی آنے لگی اور سینے میں درد ہونے لگا۔ لیکن بڑے بھیا ہاتھی بھر گہرے خیالوں میں ڈوبے رہے۔ ظہر کی نماز کے بعد وہ اٹھے۔ بیساکھی پر جھکے ہوئے لنگڑاتے ہوئے گئے۔ اور اس مکان کے دروانے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جس کی بارہ گاؤں کے اسامی بیگار میں مرمت کرتے تھے اور جواب کھنڈر ہو گیا تھا۔ پھر وہ بادل کے فیل خانے کے سامنے نیم کے گھنے پیڑ کے نیچے بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ بادل نے ہمیشہ کی طرح سونڈ اٹھا کر انھیں سلام کیا اور خوشی کی ایک آواز نکالی اور بے قرار ہو کر داہنا پیر ہلانے لگا مرحوم جنگل خاں کے چھوٹے بھائی منگل خاں نے اشارہ پاکر اس کے پاؤں کی زنجیر کھول دی۔ وہ جھومتا ہوا آیا۔ اپنی سونڈ سے ان کی سلامت ٹانگ کو سہلانے لگا۔ جو گنا گنّے چھیل چھیل کر اس کے منھ میں رکھتا رہا۔ پھر منگل خاں کو حکم ہوا کہ بادل سجا جائے۔ وہ نہلایا گیا۔ اس کے ماتھے پر گیرو اور کھریا سے نقش و نگار بنائے گئے۔ آبنوس کا منقش کٹہرہ کسا گیا وہ

نارنجی جھول پہنائی گئی جس کے حاشیے پر کام بنا ہوا تھا۔ پیتل کے چمکتے ہوئے گھنٹے پہلوؤں پر لٹکائے گئے۔ پھر وہ اس چبوترے کے پاس بٹھایا گیا۔ جس پر چڑھ کر بڑے بھیا سوار ہوا کرتے تھے۔ بادل اپنی وہ مشہور چال "شہ گام" چل رہا تھا جس کی شہرت یہ تھی کہ اگر کٹہرے پر پانی کا گلاس رکھ دیا جائے تو کیا مجال کہ ایک قطرہ چھلک جائے۔ بانس کھیرہ کے کچے، چھوٹے پیے چھتے گھر نظر آنے لگے۔ منگل خاں بڑے بھیا کے اشارے پر اس گلیارے پر گھوم پڑا جو گاؤں کو جاتا تھا۔ بانس کھیرہ کا ملو ہیتا اپنے دوارے پلنگ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا نوکر چاکر جانوروں کی ناندیں بھر رہے تھے، چارہ کھا ندرہے تھے۔ گائیں بھینسیں دودھ پی رہے تھے۔ ہاتھی کو دیکھ کر ہیتا پلنگ پر سے پھاند پڑا۔ ہاتھی کے پاس پہنچ کر ہاتھ جوڑے اور سر جھکا کر ڈنڈوت کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ پلنگ بچھایا جائے۔ قالین نکالا جائے۔ لیکن بڑے بھیا نے کھوکھلی آواز میں منع کیا اور کہا کہ تم ہیتا جانتے ہو میں لنگڑا ہوں اور مجھے ہاتھی سے اترنے میں کتنی تکلیف ہوتی۔ تم میرے ساتھ سوار ہو جاؤ تم سے ایک کام ہے۔ ہیتا نے ہاتھ جوڑ کر عذر کیا کہ سرکار میری یا مجال کہ میں آپ کے سنگ ہاتھی پر چڑھوں۔ میں تو ہاتھی کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا چلوں گا۔ لیکن بھیا کے اصرار پر مجبور ہو گیا اور کئی آدمیوں کی مدد سے بڑی مصیبتوں کے بعد کٹہرے تک پہنچ پایا۔ ایک کونے میں اکڑوں بیٹھ گیا اور بھیا کے درشنوں کے معانی نکالتا رہا۔ ملو ہیتا علاقے کا سب سے بڑا اور نامی کاشتکار تھا۔ سال میں آٹھ دس ہزار کی ادکھ دکھتا، تو شکر کے مل کو دیتا تھا۔ دوسری فصلوں کا ذکر نہیں۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد اس کے بیٹوں نے پر پرزے نکالے تھے۔ پرانا آم کا دروازہ نکال کر شیشم کا پھاٹک لگایا تھا مکان پر دوسری منزل قائم کی تھی۔ فینس خریدی

تھی شامیانہ مول لیا تھا گھر میں مسہریاں بچھائی تھیں اور قالین لگائے تھے۔ بڑے بیٹے
کے پاس دونالی بندوق تھی چھوٹے بیٹے کے پاس "کلاں راسی" گھوڑا تھا۔ کھیتی کیا کم
تھی اوپر سے مہاجنی شروع کر دی تھی۔ بس اب ایک حسرت رہ گئی تھی کہ دروازے پہ ہاتھی
جھومتا دیکھ لے۔ لیکن اس ارمان کا علم بہت کم لوگوں کو تھا ان کم لوگوں میں وہ لوگ
یقیناً تھے جو علاقے بھر کی خبریں بڑے بھیا کے کانوں میں انڈیلا کرتے تھے۔

کنوار کی ٹھنڈی رات چودہ دن کے چاند کا مکٹ دھرے ستاروں جڑی دھوتی
باندھے خوابوں کے گجرے اور لنگڑے بھیا کے ان بہے آنسوؤں کے گھنگھرو پہنے لشکرپور
پر اتر آئی تھی۔ ملو ہینا باہری دالان کے تخت پر بیٹھے لوئی اوڑھے بیٹھے تھے اور رام رتن
نیائی میں بھری ہوئی کنڈے کی آگ سے چلم دہکا رہا تھا۔ اندر کے کمرے میں لنگڑے بھیا
کی بیساکھی کے پاس منگل خاں اکڑوں بیٹھا تھا اس کے ہاتھوں کی مٹھی پر سر جھکا ہوا تھا۔
پھر اس نے نگاہ اٹھائی۔

"کا حکم ہے؟"

"تم باول کا بندوبست کرو منگل خاں..... باقی رہا تمہارا معاملہ.... تو اگر
میں بھوکا رہا تو تم بھی بھوکے رہوگے ورنہ۔" آواز حلق سے نہیں نکلی۔

ناگوار خاموشی چھائی رہی۔

پھر منگل خاں اٹھا اپنی آنکھوں کے گوشوں کو چھو کر داڑھی پر ہاتھ پھیر اور باہر چلا گیا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے ملّو جھیتا آئے اور بھیا کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ منگل خاں نے انھیں تخت پر بٹھلانا چاہا لیکن وہ زمین پر اڑے رہے۔

" تم کو معلوم ہے جھیتا ؟ میں نے اپنے گھر کی چاروں بندوقیں بھیا لوگوں کو دے دی تھیں اور بادل لے لیا تھا۔"

" سنا رہے مالک "

" اور تم اپنی بندوق کتنے کی لائے تھے "

" کوئی دو ئی سو او پر دوئی ہجار کی "

"میری ہر بندوق تمہاری بندوق سے کئی گنا قیمتی تھی۔ تو اب تم خود بتاؤ کہ کم سے کم بادل کتنے کا ہوا "

" سرکار ..... آپ کے ہاتھی کی کیمت ملّوا ہیر تو دے نا ہیں سکت ہے۔ ملّوا ہیر کی یا اوکات کہ اُو آپ کا ہاتھی کھریدے "

" ملّو میں تم کو بادل اس لیے دے رہا ہوں کہ تم اس کی خاطر کرو گے اس کو محبّت سے رکھو گے۔ کبھی میرا جی چاہے گا۔ منگا کر دیکھ لیا کروں گا۔ بہت جی اُمڈا تو سوار بھی ہو لیا کروں گا۔ لیکن اگر میں نے کسی باہر والے کو دے دیا تو "

" مالک " . . . . کا ملّو آپ کے حکم سے باہر ہے۔ ہاتھی تو سار ہاتھی ہے آپ کی جوتی ملّو کے سر پر سواری کئے سکت ہے "

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر جب ملّو بھیا کے دوارے بادل کی پیٹھ سے اترے بھیا لالٹین کی لال مدھم روشنی میں دس ہزار کے نوٹ گنتے رہے پھر لشکرپور کے پاسیوں کا ایک گروہ ملّو بھیا کو بھیجنے چلا گیا۔ اور باقی پاسی روپے کی حفاظت کے لیے مکان کے چاروں طرف پھیل گئے بھیّا نے ملّو اہیر سے اصرار کیا کہ وہ بادل پر جائے لیکن وہ نہ مانا۔ آخر بھیا نے کہا کہ کل صبح آکر اپنا ہاتھی باندھ لے جائے۔ روپے کی کوٹھری پر رام رتن اور ان کے بیٹوں کا پہرہ کھڑا کر کے وہ باہر آئے۔ بادل اپنے فیل خانے میں کھڑا تھا۔ منگل خاں اپنے دروازے پر کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ بھیا کھڑے رہے۔ دیر تک کھڑے رہے۔ جب ان کی سلامت ٹانگ دکھنے لگی اور آنکھوں کے گوشوں سے چلی ہوئی لکیروں نے گریبان کو بھگو دیا۔ ذہن میں کلبلاتا ہوا ایک ایک خیال سو گیا اور خالی ہاتھ دماغ کے پاس سوچنے کو کچھ نہ رہا تب منگل خاں کو اشارہ کیا۔ منگل خاں نے اپنے انگوچھے سے تمباکو کے رنگ کی ایک لوئی نکالی۔ بادل کی سونڈ سہلائی اور اس کا منھ کھول کر لوئی رکھ دی۔ تیز چاندنی میں چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بھیا کھڑے رہے۔ جب بھیا کی بیساکھی کی دھیمی دھیمی کھٹ کھٹ رات کے سنّاٹے میں ڈوب گئی تب منگل خاں نے فیلخانے کے شہتیر برابر کیے اور من من بھر کے پاؤں اٹھاتا اپنی کھٹیا پر پڑ رہا۔

دوسرے دن شام کو ملّو بھیا کے دوارے پر پوچھنے لگے تھے۔ ملّو کی برادری بیٹھی

تھی۔ جب ملّو ھیتا کی دوٹھن دوسری عورتوں کے ساتھ ہاتھی کے پاؤں پوج آئی تب
کہاروں نے پتوں کی تھالیوں میں گرم پوریاں اور ٹھنڈی مٹھائی پروسنا شروع کردی ملو
ھیتا اور اس کے دونوں بیٹے مہانوں کی خاطر کر رہے تھے کہاروں کو چلا چلّا کر پکار رہے تھے
اور کھانے والوں کو للکار للکار کر کھلا رہے تھے کہ نیا فیل بان مہادیو دوڑتا ہوا آیا اور ملّو کو دیکھتے
ہی پکارا۔

" تاؤ ..... تنی یہاں دوڑ آیو "

ھیتا اپنے روئی کے شلوکے سے ہاتھ پونچھتا ہوا گھر کے اس حصّے کی طرف چلا جہاں نیم
کے تنے سے بندھا بادل کھڑا تھا۔ پھر ملو ھیتا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بادل بپھرا یا ہوا تھا
اور زنجیر توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھگھیا یا ہوا ملّو ھیتا کسی کو کسی کام کے لیے پکارنے ہی
والا تھا کہ بادل نے زنجیر توڑ ڈالی اور سونڈ کو منھ میں رکھ کر فرّاٹے بھرتا ہوا چلا۔ کہرام مچ گیا۔
ذرا دیر میں سب ہنس نہس ہوگیا۔ چھوٹے چھوٹے مکان جن کی طرف بادل نے رخ کر دیا۔ وہ
مسما کر بیٹھ گئے۔ تین آدمی جو اس کے سامنے بھاگتے ہوئے گذر رہے تھے چیتھڑے ہو کر بکھر گئے۔
سارے علاقے میں بادل کے پاگل ہونے کی خبر پھیل گئی۔ تھان گاؤں کا تھانے دار "گارد" لے
کر آیا۔ سپاہیوں نے بادل پر چاندماری شروع کر دی بادل ھیتا کے چھوٹے بیٹے کی لاش
اور اپنے آٹھویں شکار کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔

" کیسا منحوس جانور ہے جس گھر میں گیا اس گھر کو اجاڑ دیا "
کوئی کہہ رہا تھا۔

▬ ▬

غبارِ شب

جھام پور کے واجب الارض کے مطابق مہادیو جی کے بیل کی وہ شاخ کاٹ دی گئی جو ٹریفک کانسٹبل کے سفید ہاتھ کی طرح تعزیوں کا جلوس روکے کھڑی تھی لیکن قصائیوں کا پنچایتی تعزیہ معمول کے خلاف اتنا اونچا تھا کہ اس کا گنبد شاخوں سے الجھ رہا تھا۔ جسم پر لپٹی ہوئی جامدانی کی پرانی اچکن لہراتے ہوئے عنایت خاں جلوس سے نکلے اور بیل کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے تفضّل حسین کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ تفضّل حسین نے اپنے فیروزی رنگے ہوئے موٹی تن زیب کے کرتے کی ڈھیلی آستینیں شانوں پر پھینک دیں، بنے ہوئے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں کی نمائش کر کے نیچی دھوتی کو لنگوٹ کی طرح کس کر باندھ لیا۔ پاس کھڑے ہوئے لڑکے کے کندھے سے بارہ سیر وزنی بانکا پھول کی طرح اٹھایا اور لانبے سیاہ فام ادھیڑ تھانیدار نے مسلّح کانسٹبل کے کان میں گھُن سے کچھ کہا۔

پھر ساری پولیس فورس سلمان تھانیدار کے پیچھے سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پیپل کے نیچے سے دور پھوٹے سے مندر تک سارے میدان میں کھچا کھچ بھرا ہوا ہندو مجمع پھنکاریں مار رہا تھا اور قلعی کیا ہوا مندر گھاگ سپہ سالار کی طرح کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ چودھری اقبال نرائن صفوں کو چیرتے، ریشمی کُرتے کے زرّیں بٹن بند کرتے ہوئے دانش پمپ کو دھول سے بر بر اکر قدم رکھتے نکلے اور عنایت خاں سے تھوڑے فاصلے پر رک گئے۔ ہندو لٹھ بندوں کا ایک دستہ نکل کر ان کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

عنایت خاں نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کاندھے پر پڑا ہوا سبز اونی چادر کھینچ کر کمر سے باندھا۔ سر کا پھُولا پھُولا صافہ کس کر لپیٹا۔ پھر باجے بجانے والوں نے دلوں میں آگ لگا دینے والی دُھن کو جھوم جھوم کر بجانا شروع کر دیا۔ جوگیوں کے چودھری نے للکارا اور ریشمی کرتے اور کارچوبی واسکٹیں پہنے ہوئے جوگیوں کے لڑکے چیخ چیخ کر نوحے پڑھنے لگے اور اچھل اچھل کر ماتم کرنے لگے۔ اکھاڑوں میں کرتب دکھانے والے اپنے اپنے استادوں کے پیچھے لکڑیاں ہلاتے بانے گھماتے اور تلواریں چمکاتے دوڑے اور عنایت خاں کے پیچھے پھیل کر کھڑے ہو گئے۔ عنایت خاں کی سفید بھوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی مطمئن آنکھیں چمکیں اور تفضّل حسین پر گڑ گئیں۔ تفضّل حسین نے چڑھنے کے لیے بانکے کے پھل کو رومال میں لپیٹ کر منھ میں دبایا اور درخت پر ہاتھ جما لیے۔ کسی من چلے نے "یا علی" کا نعرہ لگایا جس کی تہلکہ ڈال دینے والی تکرار نے بڑے بڑے دلوں کو ہلا دیا۔ پھر چودھری اقبال نرائن گرجے۔

"قانون ہو چکا خاں صاحب ...... اب پیپل نہیں کٹے گا"۔

تفضّل حسین نے پاؤں اتار لیا اور عنایت خاں کو دیکھا۔ عنایت خاں نے پرسکون آواز میں تھم تھم کر کہا۔

"پیپل تو کٹے گا چودھری جی!"

"نہیں کٹ سکتا"۔ چودھری کی آواز پھٹ گئی۔

"تو تعزیے نہیں اٹھیں گے"۔

"نہ اٹھیں"۔

پھر تعزیے رکھ دیے گئے۔ ان کو اٹھانے والے ہندو مزدور بیڑیاں پینے لگے۔ خوانچے والے بھاگ کر اس مسجد کے نیچے آگئے جہاں دور کھڑی عورتیں تماشا دیکھ رہی تھیں۔ بھڑکدار کپڑے اور کھنک دار زیور پہنے چمکتی کھنکتی عورتیں مٹھائی کے دونے اور گود کے بچے سنبھالے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگیں۔ قصابیوں اور گدیوں کے چودھریوں نے تعزیوں کے گرد لاٹھیوں کا حلقہ کھڑا کر دیا اور اطمینان سے چلمیں پینے لگے۔ عنایت خاں کے منھ سے کف جاری ہو گیا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ کمر کے چادرے کی گرہ مضبوط کی اور لمبے لمبے ڈگ رکھتے بھاگے۔ راستے میں ملتے ہوئے سلاموں پر گالیاں سُناتے جلوس کی طرف راہ گیروں کو ڈھکیلتے میاں لے پھاٹک تک آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے آدمیوں نے اندر شیخ کو خبر دی۔ بیمار شیخ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ عورتیں چھپ گئیں۔ عنایت خاں دھکتے برستے اندر پہنچے۔ شیخ نے بڑی اذیت سے اپنے کو ابھارا اور

گاؤ تکیے میں کہنیاں گاڑ دیں۔

"چودھری اقبال نرائن نے تعزیے روک دیے ہیں" عنایت خاں نے کھڑے کھڑے وار کیا۔

"ہوں!"

"قصائیوں کا پنچایتی تعزیہ اگر دو چار انگل اور اونچا ہو گیا تو کیا جلوس میں نہیں چلے گا؟"

"اقبال سے کہو..... میں ابھی مرا نہیں ہوں..... پیپل کٹے گا"

عنایت خاں کے جاتے ہی نوکر دوڑنے لگے۔ بندوقیں نکالی گئیں۔ سپاہی کیل کانٹے سے لیس ہو کر ڈیوڑھی پر لگی ہوئی فنیس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہاروں کی قطار انتظار کرنے لگی۔ شیخ نے لیٹے لیٹے پائجامہ بدلا۔ بیٹھے بیٹھے اچکن پہنی، اپنے ہاتھ سے پلّہ چُنا اور سر پر رکھ لیا۔ رنبیر نے آہستہ سے ان کے پاؤں میں جوتا پہنا دیا۔ رام سکھ اور لچھمن داس نے پولے ہاتھ سے سہارا دے کر ان کو اٹھایا لیکن پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ شیخ نے دو قدم گھسیٹے، پھر گردن ہلائی اور کھڑے ہو گئے۔ اشارہ پاتے ہی نوکروں نے مسہری پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ منکا ڈھل گیا۔ اور ہلڑ مچ گیا۔ عورتیں چیخنے پکارنے لگیں۔ پھر پردہ ہوا سینکڑوں چارپائیوں کو نگل جانے والا آنگن آدمیوں سے بھر گیا۔ حکیم غلام حسین دواؤں سے لدے پھندے آئے۔ تھانیدار الیاس نے اپنے کانپتے ہاتھ سے بید مشک کا چمچہ شیخ کے منھ میں انڈیل دیا۔ شیخ نے آنکھیں کھولیں۔ تیرتے ہوئے دیدوں

کو تھام کر اکلوتی اپنی اولاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی تیسری بیوی کی اکیلی نشانی جمیل کو دیکھا جو اُن کا پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔ آنکھوں کے گوشے پانی کی لکیروں سے چمک اٹھے۔ پھر چودھری اقبال نرائن ہانپتے ہوئے آئے اور ان کا دوسرا پاؤں گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ شیخ نے چودھری اقبال نرائن کو دیکھا اور کمزور آواز میں بولے۔

"یہ کیا ہے ؟"

"کچھ نہیں چاچا۔"

"تعزیے ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ رکھ ۔ ۔ ۔ ۔ دیے ؟"

"کہاں رکھ دیے گئے تعزیے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں سے جاتے ہی تعزیے اٹھواتا ہوں ۔ ۔ ۔ آپ آرام کیجئے۔"

"عنایت ۔ ۔ ۔ خاں۔"

"چاچا ۔ ۔ ۔ عنایت خاں جھوٹے ہیں ۔ ۔ ۔ فسادی ہیں ۔ ۔ ۔ بھلا تعزیے بھی کوئی رکنے کی چیز ہیں ؟"

پھر چودھری اقبال نرائن اٹھے اور اپنے مسلمان سپاہی کو حکم دیا کہ بیل کو کٹوا دو اور باجے بجواؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیخ چاچا کو اطمینان ہو جائے۔

حکیم غلام حسین نبض پکڑے بیٹھے تھے۔ چودھری اقبال نرائن کا سپاہی نئی سائیکل پر سیتاپور ڈاکٹر لینے جا چکا تھا۔ شیخ محمد مظفر میں جھام پور کی سانس کا کچا دھاگا ٹوٹ گیا۔ باجے ایک بار پھر رک گئے۔ عورتوں نے کہرام برپا کر دیا۔ میراثنیں جو نوحے پڑھنے آئی تھیں

شیخ کے بین کرنے لگیں۔ پیپل کی شاخیں تو کٹ گئیں لیکن جلوس اجڑ گیا۔ تعزیے ہاجروں کی طرح سر جھکائے مقررہ راستوں پر چلتے ہوئے بارہ بجے رات کے بجائے دن کے دو ہی بجے دفن ہو گئے۔ چاروں طرف آدمی دوڑنے لگے۔ لالہ سدگو رئیس مانک پور پھاٹک کے قریب چلتے ادھے سے پھاند پڑے اور شیخ کے جنازے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار گر گر پڑے، کئی بار سپاہیوں نے اٹھایا، پھر شیخ کا ہاتھ چادر سے نکال کر منہ پر رکھ لیا اور چیخ مار کر کہا۔۔۔

"آج کمر ٹوٹ گئی۔"

اور پچھاڑیں کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گئے۔

شیخ کے کچے دیوان خانے کے پھاٹک سے دور سڑک تک پھیلا ہوا مجمع بڑھتے بڑھتے اسکول کے احاطے تک پہنچ گیا۔ تین تین کوس کا ایک ایک آدمی شیخ کو مٹی دینے کے لیے آچکا تھا لیکن شیخ اپنے کپڑوں میں لیٹے تھے۔ ان کی شیروانی اسی طرح مسہری کے نیچے پڑی تھی۔ سترکھ کے ٹھاکر بھارت سنگھ کا انتظار تھا جن کو لانے کے لیے سترکھ کا موٹر لکھنؤ جا چکا تھا۔ جلوس کی گیسیں اور ہنڈے اندر سے باہر تک جل رہے تھے۔ پھر سترکھ کے ٹھاکر آگئے۔ شیخ کی پٹی پر سر رکھ کر روتے رہے۔ کہیں سے لالہ سدگو نکل پڑے۔ بھارت سنگھ ان سے لپٹ گئے۔

"آج باون برس کا ساتھ چھوٹ گیا، گرو!"

"آج جوار اُجڑ گیا۔"

وہ چیختے رہے اور روتے رہے۔

پھر چودھری اقبال نرائن نے دونوں کو چھڑایا۔ شیخ نہلائے گئے۔ جب ان کو کفن پہنایا جارہا تھا تب ٹھاکر نے لالا سدگر کا بازو پکڑ کر کہا۔

"اس کی شادی کے کپڑے بھی ہم دونوں نے پہنائے تھے.... آؤ کفن بھی پہنادیں۔"

بھام پور کی مسجد سے بھام پور کے رئیسوں کے قبرستان تک دو میل کا کچا راستہ آدمیوں سے بجک رہا تھا۔ سارے راستے ٹھاکر بھارت سنگھ تعلقدار سترکھ اور لالہ سدگر نرائن رئیس مانک پور نے کاندھا نہیں بدلا۔

درختوں کے پھل آنسو بن کر ٹپک گئے۔ زرد پتّوں کی لاشوں کے بچھونے بچھ گئے۔ جوگن پُروائی نگر نگر دکھ کے بھجن گا گا کر تھک گئی۔ آخر آخر وقت کے طلسمی چشمے میں جمیل نے اپنے دلدّر دھو لیے۔ غم کی گھٹا برس کر کھلی تو نئے روشن آسمان پر یہاں سے وہاں تک مستقبل کی دھنک کھڑی تھی۔ شیخ کے چہلم کے بعد وہ اپنی ماں کے بغیر رنگے چُنے چادرے جیسے سفید دوپٹے سے جھولتی ہوئی ننگی سونی بادامی کلائیوں کے ہار اپنی کلائیوں سے اتار کر باہر آیا۔ دیوان خانے میں اونگھتی ہوئی آرام کرسی پر دیر تک مجسّمے کی طرح بیٹھا رہا۔ کام کرتے نوکروں اور چلتے پھرتے سپاہیوں کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کھلے ہوئے پھاٹک سے سڑک پر آدمیوں کے گزرتے ہوئے گلّوں کو گھورتا رہا۔ پھر اندر آکر لکڑی کی سیڑھیوں پر بچھی ہوئی

گھسی پٹی چٹائی پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ تخت پر ڈھیر ٹھنڈے پتلونوں
اور گرم شیروانیوں کے انبار کو صندوقوں میں قید کر کے وزنی تالوں کا پہرہ لگا دیا۔ ان کتابوں
کو الماریوں میں ٹھونسنے لگا جن پر شیخ محمد جمیل کلاس دہم گورنمنٹ اسکول سیتاپور کے
قلمی مونوگرام بنے تھے۔ ان کی خاک سے اب بھی اس مستقبل کی بشارت کی خوشبو آرہی تھی جو
بی اے کی سرحد کے پار کھڑا تھا۔ تھوڑے دنوں قبل جس طرح اس نے اپنے باپ کو قبر میں
اُتارا تھا اسی طرح ان کاغذی لاشوں کو دفن کر کے وہ اپنے ہاتھ جھاڑتا نیچے اتر آیا۔

اساڑھ بھر چکا تھا لیکن آسمان نیلے شیشے کی چادر کی مانند تنا کھڑا تھا۔ سورج تاریخ
کے جبر کی طرح بے گناہ انسانوں پر برس رہا تھا۔ وہ دیر تک دیوان خانے کے کچے طویل ٹھنڈے
دالانوں میں ٹہلتا رہا۔ پھر بغیر گلس لگائے بغیر ہیٹ لیے باہر نکل پڑا۔ پھاٹک پر چلم پیتے سپاہیوں
نے لپک کر لاٹھیاں اٹھائیں لیکن "بھیا" نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔ ٹرک
پر مڑتے ہی پرچون اور مٹھائی کی دکانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی نے اس کے وجود
کا اقرار نہ کیا۔ کسی نے سلام کے لیے دو انگلیاں نہ اٹھائیں۔ اس کی نگاہ سے نگاہ مل جانے کے
خوف سے سب سر جھکائے اپنے آپ کام میں مصروف رہے۔ وہ سر جھکائے گزر گیا۔ آگے
بکر قصابوں کی دکانوں پر ہندو خریدار چمکتی چھریوں اور چیختے گلوں کے نرغے میں کھڑے
اپنے آپ کو اپنی اہمیت کا یقین دلا رہے تھے۔ وہ اجنبی سا گزر تو گیا لیکن ذہین طبیب
کی طرح نئے مریض کا مرض تشخیص کرتا رہا۔ ان اہم آدمیوں کے متعلق سوچتا رہا جو شیخ کی زندگی
میں اس کے کتوں کو چمکارتے تھے اور منھ سکھائے اس کے چہرے کو پڑھا کرتے تھے۔ اب وہ

اپنے کھیتوں میں آگیا جہاں اس کے نوجوان نوکر تپتی دھوپ میں کنوئیں کی چرخی چلا رہے تھے اور کھیت سینچ رہے تھے۔ بائیس برس کی زندگی میں وہ پہلی بار اپنے کھیتوں کی نگرانی کے لیے آیا تھا۔ بوڑھے بوڑھے سیربانوں نے ہانک لگائی اور قریب کے گاؤں سے پلنگ، چھتریاں، پنکھے دودھ اور شربت کے چمکتے لوٹے اور ٹھنڈے پانی کے گگرے چلنے لگے۔ ایک مینڈھ پر پلنگ پڑ گیا۔ اونی قالین بچھا دیا گیا۔ ایک سیربان چھتری کھول کر کھڑا ہو گیا اور کئی آدمی دودھ اور شربت لیے بیٹھے رہے لیکن وہ بھیگی، چکنی اور ٹھنڈی مینڈھوں پر ٹہلتا رہا۔ پھر رام سکھ نے اپنی آدھی دھوتی سے سفید بالوں سے بھری چھاتی چھپالی اور بڑی بجھا کر کان میں لگالی اور اس کے پیچھے پیچھے ٹہلنے لگا۔

"بھیّا!"

"اوں!"

"جل پان کر لیو آپ"

"مجھے خواہش نہیں ہے۔"

"یہ رسم ہے مالک"

نوکروں کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ کنوئیں کی چرخی تھم گئی اور بہت سی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"رسم ہے"

"ہاں مالک.... آپ پہلے دن اپنے راج ماں آئے ہو"

"راج؟"

"راج.... چاہے چھوٹا ہو.... چاہے بڑا.... مل راج راجے ہے۔"

اس نے گردن ہلا کر حیرت کا اظہار کیا اور دو گھونٹ دودھ ملا ہوا گُڑ کا شربت پیا اور دو درجن کلّیاں کیں۔ پھر ٹہلتا ہوا اپنے گاؤں بھٹارہ کی طرف چلنے لگا۔ بھٹارہ وہ گاؤں تھا جس میں بارہ موضعے لگتے تھے اور جو شیخ کی آبرو تھا۔ مٹی کے چھوٹے گندے اور بے ہنگم مکانوں کی قطاروں کے پاس پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی دو درجن آدمیوں کی چلتی ہوئی قطار ٹھٹھک گئی۔ گاؤں کے بچے اسے دُور سے دیکھتے اور بھاگ جاتے۔ عورتیں اپنے گھونگھٹ کھینچ کر منہ گھما کر کھڑی ہو جاتیں، آدمی جھک کر سلام کرتے اور ساتھ ہو لیتے۔ بوڑھی عورتیں خود ہی سلام کرتیں اور خود ہی منوں دعائیں دے ڈالتیں۔ بیچوں بیچ گاؤں میں شیخ کا بنوایا ہوا اکھٹار کھڑا تھا جس کے صحن میں املی کا چھتنار درخت تھا۔ اس کے نیچے رنگین پایوں کا نواڑی پلنگ بچھا تھا جس پر ادنی قالین پڑا تھا۔ بوڑھوں کے اصرار پر وہ گھڑی بھر کے لیے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس گاؤں کا ایک ایک آدمی املی کے نیچے جمع ہو گیا۔ پھر نذر شروع ہوئی جب اس کے قدموں میں بچھے ہوئے رومال پر چاندی کے روپوں کا ڈھیر لگ گیا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چھنچھناتا ہوا رومال اٹھایا اور بھٹارہ کے بیرداد رام سکھ کے حوالے کر دیا۔ اَن گنت سلاموں کا ایک اشارے سے جواب دیتا ہوا وہ پھر اپنے ان کھیتوں کی طرف ہو لیا جہاں کام ہو رہا تھا اور ایک سیربان کی چھتری کے سائے میں پلنگ پر نیم دراز ہو کر تقدیر کی اس عبارت کو پڑھنے لگا جو

اس کے مستقبل کے ماتھے پر لکھ دی گئی تھی۔

"جے ہو"

جمیل نے چونک کر دیکھا تو ایک پانچ فٹ کا دُبلا پتلا آدمی سامنے کھڑا تھا جو صرف ایک لنگوٹی باندھے تھا۔ ٹھڈّی پر جگّی داڑھی تھی اور کھیاچوں کی باہوں پر جٹائیں ہی لہرا رہی تھیں۔ پیٹھ پر بڑی سی گٹھڑی لدی تھی جسے وہ پتلے پتلے ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے تھا۔ ہر سانس پر اس کی پسلیاں نظر آجاتیں جیسے چھچلے صاف پانی میں ریت کی دھاریاں نظر آتی ہیں ــــ

"رام داس بابا!"

"ہاں بچّہ! ..... بڑھتی ہو ..... آنند رہو"

"بابا کو چلم پلاؤ"

یہ حکم صادر کر کے وہ پھر اپنے خیالوں کے دیس میں لوٹ گیا۔ بابا کو نوکروں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ نوعمر نوکر بابا سے ٹھٹھول کرنے لگے مگر بابا بے نیازی سے چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے چلم کے دم لگاتے رہے۔

"یار بابا .... تم دیکھت ہو ..... آج کیسی آگی برس رہی ہے۔

کسی لڑکے نے بابا کو چھیڑا۔

"تو بابا دکھیا کا کریں؟"

دوسرے نے جواب دیا۔

بابا دکھیا یُوکریں کہ تنی پانی برسائے دیں۔"

اس نے تڑسے کہا۔

"ہوں!"

بابا نے نرم اور نم زمین میں چلم گاڑ دی۔ اب دوسرے نوکروں نے بھی بابا کو گھیر لیا اور کئی زبانیں ایک ساتھ چلیں۔

"یار بابا۔۔۔ آج برسائے دیو پانی۔"

بابا اب آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکے تھے۔ نوکروں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ننگ دھڑنگ آدمی پسینے میں اس طرح چمک رہے تھے جیسے چور بدن پر تیل مل کر نقب لگانے نکلے ہوں۔

"کا۔۔۔ جو بھیّا کہہ دیں۔۔۔ تو آج برسائے دیں۔"

اور بھیا جو دور اجان سے بیٹھے تھے چونک پڑے۔ بابا کے اس جملے سے تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا پھر کئی آدمی بول اٹھے "بھیّا! آپ کہہ دیو۔"

اور بھیّا نے کہہ دیا۔ بابا نے اپنی گٹھری کھولی۔ پوٹلی سے راکھ نکال کر بدن پر ملی اور آسن جما کر بیٹھ گئے اور جاپ کرنے لگے۔ نیلے شیشے جیسے آسمان پر بادل کا دُور دُور تک ایک دھبّہ بھی نہ تھا۔ درجنوں آنکھیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کدھر سے ایک بھورا بھورا بادل کا ٹکڑا آیا اور تڑ تڑ بوندیں پڑنے لگیں۔ گھڑی بھر میں کوئی فرلانگ بھر کا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ نوکر تو نوکر خود بھیا سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ منھ سے آواز نہیں نکلتی تھی پھر اسی عالم میں بابا ایک طرف نکل گئے اور کسی کو بولنے کا یارا نہ ہوا۔ گھر پہنچ کر جمیل کو احساس ہوا

کہ بابا کو وہ چوتی نہیں ملی جو مرحوم شیخ نے مقرر کر دی تھی لیکن اب بابا کہاں ......؟

سارے بھام پور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کم سے کم ایک نفر ان کی تلاش میں نہ نکل گیا ہو۔

بھام پور اور اس کے جوار کی ساری سیاست پر شیخ کا حکم چلتا تھا جو بھام پور کی تین ہزار کی آبادی میں سب سے زیادہ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خان کو کھلتا تھا۔ چودھری اقبال نرائن جس اثر اور اعتبار کو روپے سے خریدنا چاہتے تھے، اُسے عنایت خاں اپنی "قوم" کی اکثریت کی بنا پر ہتھیانا چاہتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہندوؤں کے اکثر معاملات چودھری اقبال نرائن کی بیٹھک اور مسلمانوں کے بیشتر مسئلے عنایت خاں کے چوپال میں طے ہونے لگے۔ اس کے باوجود دونوں کے راستے میں شیخ کی پرانی چوکھٹ کی روایتی بزرگی پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔ تحصیل اور ضلع کے حکّام جب بھام پور میں قدم رکھتے تو چودھری اقبال نرائن جواب چودھری صاحب اور عنایت خاں جو خاں صاحب بجنے لگے تھے چیل کی طرح جھپٹتے اور جمیل کو لائے بغیر بالا ہی بالا معاملات کو حسبِ مرضی طے کر کے رخصت کر دیتے۔ جمیل کے اس دکھ میں بھام پور کے "نیچ قوم" کے چند ہندو مسلمان گھرانوں کے علاوہ بھٹارہ اور اس کے مزارعے شریک تھے جو شیخ کے مرنے کے بعد سیاسی طور پر لاوارث سے ہو چلے تھے۔

پہلا دونگرا ٹوٹ کر گر اتھا۔ کچے مکانوں کے پپڑے پھول پھول کر گرنے لگے تھے دم بھر کو ذرا سا آسمان کھلا تھا۔ سنہری دھوپ نے مٹی کے بھونڈے برتنوں جیسے مکانوں

پر میلی میلی سنہری قلعی سی کر دی تھی۔ نہائے ہوئے درختوں کی شاخوں سے بوندیاں ٹپک رہی تھیں۔ جمیل دالان میں بیٹھا اپنی دیوپیکر بھینسوں کی اٹھکیلیاں دیکھ رہا تھا جو بارش کے پانی میں نہا کر مست ہو رہی تھیں کہ ڈیوڑھی پر ہنگامہ برپا ہوا۔ وہ گیا تو دیکھا کہ نشی بجم قصاب کا بیٹا تیور بگاڑے کھڑا ہے اور رسولن بوا تانبے کی پلیٹ میں گوشت لیے بڑبڑا رہی ہیں اور اندر صحن میں اماّں برس رہی ہیں۔

" ابھی تو جنتی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور ابھی سے یہ نمک حرامی ...... کہ میرے گھر میں کتوّں کا راتب آنے لگا..... اللہ کی شان.... رسولن!"

"جی!"

" پٹخ دے یہ پلیٹ اس حرامزادے کے منہ پہ..... ہمارا وقت بگڑ گیا ہے تو ہم نہیں کھائیں گے گوشت.. جب ہمارا وقت پلٹے گا تب ہم گوشت کھالیں گے۔"

جمیل کو دیکھتے ہی بوا غراّئیں۔

" اے بھیاّ.... گھنٹوں بیٹھے ریں ریں بھیک ایسی مانگا کریں تب یہ گوشت نصیب ہو..... منھ سے کچھ بولیں.... تو چھریاں چمکا کے کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔"

وہ پاؤں پٹختا باہر آیا۔ بیلوں کے مکانوں میں نوکر چاکر سانی پانی کر رہے تھے۔ رام غلام اس کے تیور دیکھتے ہی بالٹیاں زمین پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

" رام سکھ کو بلاؤ۔"

وہ گرجا اور رام غلام بجلی کی طرح دیوار سے لگی سائیکل لے کر پھاٹک سے نکل گیا۔

رام سکھ "سرکاری کھیتوں میں" "اسامیوں" سے دھان بوا رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی رام غلام سائیکل سے پھاند پڑا۔

"بلّوا ہے"

"کا ہے؟"

"بھیّا برجھائے گئے ہیں"

"کی پر"؟

"چکوا (بکر قصاب) سارے بدماس ہیں"

"ہوں ..... تم تو چیل رکھو ..... ہم آیت ہیں"

پھر اس نے چلم کا آخری دم لگایا اور کام کرتے آدمیوں کو مختلف موضعوں پر روانہ کر کے حکم دیا کہ آدمی سنبھل کر دوار ے پہنچیں۔ خود بھٹارہ کے آدمیوں کو بٹورنے چلا۔ بھٹارہ اور اس کے مزارعوں میں پاسیوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی۔ دوراندیش شیخ نے ان کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ شیخ ضلع سیتاپور میں واحد رئیس تھے جو پاسیوں کے یہاں ڈنکے کی چوٹ پانی پیتے تھے اور کھلّم کھلّا گائے کے گوشت کی مذمت کرتے تھے، بھام پور میں کوئی ایسا نہیں تھا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ شیخ نے کبھی گائے کا گوشت کھایا ہے۔ اس کے بدلے میں بھٹارہ اور اس کے جوار کے پاسی سؤر نہیں پالتے تھے اور عام طور پر مشہور تھا کہ سؤر کھاتے بھی نہیں تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ کے جھوٹے برتن تک پاسی اٹھاتے تھے اور شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کرتے تھے۔ رام سکھ اپنی "قوم" کا

سب سے اہم آدمی تو تھا ہی لیکن شیخ کی مراعات نے اُسے جوار کا سب سے اہم آدمی بنا دیا تھا۔ وہ شیخ کے پردے میں سارے جوار پر حکومت کرتا تھا۔ شیخ کی موت کا سب سے زیادہ اثر جمیل کے بعد رام سکھ ہی پر پڑا تھا اور بڈھا رام سکھ اندر ہی اندر اپنے اقتدار کو واپس لانے کے لیے بساط بچھائے بیٹھا تھا اور موقعے کا منتظر تھا۔ آج موقع آگیا تھا وہ بڑے انتظام سے چلا۔

منشی گوشت کی دکان تو وضعداری میں لگاتا تھا۔ اس کی اصل تجارت کھالوں کی تھی۔ وہ سارے جوار اور سیتاپور سے کھالیں خریدتا اور کلکتے میں سودا کرتا۔ بکر قصابوں کا چودھری تو تھا ہی اب حج کر کے جھام پور کے معززین کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔۔۔۔ عنایت خاں سے اس کے سادیانہ تعلقات تھے اور چودھری اقبال نرائن سے لین دین تھا۔ شیخ کی زندگی بھر چپ رہا۔ ان کے مرتے ہی جھام پور کے اکلوتے حاجی نے پَر پُرزے نکالے۔ سماجی برتری کے لیے گیارھویں شریف میں پلاؤ کی دیگیں پکوائیں اور محرّم میں شکر کے شربت کی سبیل لگائی۔ منشی زوروں پر جا رہا تھا کہ بیٹے نے یہ خبر سُنائی۔ اس نے فوراً لنگی سے لانبا کرتا اتار کر پہنا اور شرعی پاجامے پر چادر کا صافہ باندھا اور عنایت خاں کے چوپال کی طرف ہو لیا۔ وہاں محاذ بنا کر چودھری اقبال نرائن سے ساز کیا اور راستے بھر اپنے دل کو اطمینان دلاتا رہا کہ آج اگر فتح ہو گئی تو بیڑہ پار ہے۔ پھر دکان پر پہنچ کر اس نے اپنے بھائی بندوں کو اکسایا کہ زمیندار چودھری اقبال نرائن بھی ہیں مگر وہ ہم سے کبھی چار آنے سیر گوشت نہیں مانگتے پھر جمیل بھیا میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہیں کہ ہم سارے

جہاں میں تو روپے سیر بیچین لیکن وہاں چار آنے سیر گوشت پھینک آئیں۔ منشی کی گفتگو سب نے غور سے سنی لیکن پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں پیشہ ورانہ رقابت اور برادرانہ چپقلش کا بھی دخل تھا۔

رام سکھ کے "دوارے" پر پہنچتے ہی چاروں طرف سے آدمی گرنے لگے جیسے جھیل پر سرمائی چڑیوں کے غول اترتے ہیں اور جب رام سکھ کو اطمینان ہو گیا تب وہ سر پر مریٹھا باندھ کر اور سات ہاتھ کا لٹھ کندھے پر رکھ مضبوط قدم رکھتا "بھیّا" کے سامنے آیا۔ قبل اس کے کہ وہ سلام کرے "بھیا" گرجے۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"پکڑ کر لاؤ منشی کے بچے کو۔"

اور رام سکھ بھاگی ہوئی بکری کی طرح منشی کو بازو سے پکڑ کر لے آیا۔ اس کے بیٹوں بھتیجوں نے چھکنے کی کوشش کی لیکن آدمیوں کا بادل دیکھ کر بجھ گئے۔ پھاٹک کے بازو میں منقش ستونوں پر رکھے ہوئے چھپر کے سامنے "بھیّا" ٹہل رہے تھے۔ منشی کو دیکھتے ہی حکم ہوا۔

"باندھ دو"

منشی باندھے جانے لگے تو الجھ گئے۔ بھیّا نے ایک ہرواہے کے ہاتھ سے بیلوں کو ہانکنے والا چابک کھینچ لیا اور تھوڑی دیر میں منشی فرش ہو گئے۔ پھر منشی کی دکان بھنگیوں میں بانٹ دی گئی۔ چھپر پھونک دیا گیا۔ بیٹے بھتیجے بھائی برادری میں چھپے رہے۔ پھر

ایک لونڈے نے منشی کو گھٹری بنا کر اٹھایا اور ان کے تر واہے میں پٹک آیا۔ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں کمیٹی کر رہے تھے کہ رام سکھ سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر تھانے گیا اور "بھیا" کا دستی کا خط تھانیدار کے حوالے کیا۔ تھانے دار نے اس لڑکے کا خط پڑھا جس کے باپ کے افسانے مشہور تھے اور جس کا تھانے دار الیاس نے جاتے جاتے تعارف کرا دیا تھا۔ گھوڑے پر چڑھ کر بھام پور کے پھاٹک پر اتر پڑا۔ چوڑی ہڈی اور لانبے قد کے سُرخ و سفید "جمیل میاں" نے اپنے انگریزی بالوں کو انگلیوں سے برابر کیا۔ پائجامے کی چوڑیاں درست کر کے مخملیں جوتا پہنا اور نوابوں کی طرح برآمد ہوئے۔ آتے ہی مُرغ کٹوانے اور کڑھائیاں چڑھوانے کا حکم دیا اور تھانیدار سے جو "الیاس چچا" کے واسطے سے مشفقانہ برتاؤ کر رہا تھا' باتیں شروع کر دیں۔ اسکول کی باتیں، فٹ بال کی باتیں اور شکار کی باتیں، تھانیدار پوری دلچسپی سے سُن رہا تھا اور گفتگو میں شریک ہو رہا تھا۔ پھر جب کا اُستھ تھانیدار مرغ اور پراٹھے کھا چکا تب جمیل نے مطلب کی بات چھیڑی۔ تھانیدار سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ شام کو جمیل سے کچھ کہے بغیر تھانیدار اپنے گھوڑے پر چڑھ کر روانہ ہو گیا اور جمیل جھنجھلایا ہوا سوچتا رہا کہ وہ سترکھ جا کر بھارت بابا سے داروغہ کی شکایت کرے یا مانک پور جا کر سدگرو چاچا سے۔ لیکن بڈھے رام سکھ نے اسے کہیں نہ جانے کا مشورہ دیا اور بیٹھا ہوا چوڑی چوڑی مونچھوں کے اندر مسکراتا رہا، چلم پیتا رہا۔ رات چڑھتے ہی شور ہوا۔ جمیل نے سپاہی کو حکم دیا کہ معلوم کرے کیا قصّہ ہے۔ پتہ چلا کہ منشی کو تھانیدار باندھ لے گئے۔ جمیل کا جی چاہا کہ اتنے زور سے قہقہہ لگائے کہ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں دونوں کے کانوں کے پردے پھٹ

جائیں اور صبح تک وہ بیچرے دھکڑ مچی رہی کہ ساری بستی لرز اٹھی۔

اس سال تو بابا رام داس نے آسن بھی نہیں جمایا تھا، جاپ بھی نہیں کیا تھا مگر پانی تھمنے ہی کو نہ آتا تھا۔ سڑکوں پر نہریں چل رہی تھیں۔ لڑکے سیر دن بھوریں پکڑ پکڑ کر اپنے گھر لے جاتے۔ آخر مندروں میں کیرتن ہوئے، مسجدیں اذانوں سے گونج اٹھیں، استغفار کی نمازیں وہ بھیڑ ہوئی کہ سیڑھیوں پر صفیں کھڑی ہوئیں۔ تب کہیں اللہ اللہ کر کے چودہ دن بعد دھوپ کی صورت نظر آئی۔ دھوپ نکلتے ہی آدمی اس طرح بلبلا کر نکل پڑے جیسے الکشن کے موسم میں لیڈر نکلتے ہیں اور مکانوں کی مرمت کا بندوبست کرنے لگے۔ رام سکھ نے بھیّا کو مشورہ دیا کہ بانس، سینٹھا، پتاور، بھوسہ اور بھانجہ اگر قاعدے سے بیچا جائے تو ہزار ڈیڑھ ہزار سے کم کا نہیں ہے۔ بھیّا نے سنا اور دیر تک سر جھکائے ٹہلا کیے۔ پھر جھام پور سے بھٹارہ تک سارے ضرورت مندوں کی فہرست بنائی اور کھڑے کھڑے سب تقسیم کر دیا اور آدھے دن میں بھیّا کا نام بانس پر چڑھ گیا۔ شیخ کو مرے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ جھام پور اور جوار کے سارے معاملے "بھیا" (جمیل) کے دیوان خانے میں طے ہونے لگے۔ چودھری صاحب پھر چودھری اکبال نرائن، اور "کھاں صاحب" پھر عنایت خاں ہو کر رہ گئے۔

جب ہولی آگئی پیکر مر چلنے لگا تب ہمیشہ کی طرح مسر کھ کے میلے کا اہتمام ہوا اور ریلوے

لائن کے پچھم میں ٹھاکر صاحب سترکھ اور لالہ سدگر آف مانک پور کے درمیان کا پلاٹ بھام پور والوں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ سترکھ اور مانک پور کے خیمے لگ بھی گئے اور آباد بھی ہو گئے لیکن بھام پور والے پلاٹ پر دھول اڑتی رہی۔ جب میلے کی گہما گہمی شروع ہو گئی تب ٹھاکر بھارت سنگھ نے پاسی کو خط دے کر بھام پور بھیجا اور "بھیّا" نے بھارت بابا کے خوف سے مجبور ہو کر اسی وقت خیمے روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ بھاڑہ کے آدمیوں نے "راتی راتا" ویران ٹکڑے کو آباد کر دیا۔ دوسرے دن چار ادھے جوڑے گئے اور بھیا اپنے نوکروں کے ساتھ سوار ہوئے۔ پڑاؤ پر اترتے ہی دونوں خیموں میں شور مچ گیا کہ بھام پور والے بھیا آ گئے۔ ٹھاکر کا مسلمان سپاہی بوٹے خاں ناف تک لہراتی ہوئی سفید داڑھی پر زعفرانی صافہ باندھے مہندی سے رنگی لاٹھی کندھے پر رکھے سامنے آیا اور فرشی سلام کر کے عرض کیا کہ ٹھاکر انتظار کر رہے ہیں۔ بھام پور والے بھیّا الساتے ہوئے اٹھے اور بالوں کی گرد رومال سے صاف کرتے ہوئے دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ ٹھاکر مسہری پر گاؤ تکیہ کے سہارے پیروں پر لوان ڈالے نیم دراز تھے ان کے پاس ہی آرام کرسی پر لالہ سدگر بیٹھے پیچوان کڑکڑا رہے تھے۔ دونوں نے دعائیں دیں پھر اس تاخیر پر میٹھے لہجے اور نازک الفاظ میں ڈانٹا۔ بھام پور والے بھیّا سفید بچوں کی طرح بھولا بھولا چہرہ جھکائے سنتے اور معصوم آنکھوں پر لانبی لانبی پلکیں جھپکاتے رہے۔ پھر بھام پور والے بھیّا کا مسلمان نوکر براتی سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے؟"

بھیّا نے پوچھا۔

" اتنے وخت جو کھائے وہ پکایا جائے "

ٹھاکر اور بھیّا کے بولنے سے پہلے لالہ سدگر اپنی کرسی سے ابھرے اور چوڑی چوڑی کھچڑی بھویں اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

" تم کو جو کھانا ہو وہ پکا لو..... بھیا کا کھانا نہیں پکے گا "

بھیّا تو کسما کر رہ گئے لیکن ٹھاکر بول اٹھے۔

" شیخ تو میرے ساتھ کھایا کرتے تھے سدگر "

" ہاں لیکن آپ بیمار ہیں اور یہ بغیر گوشت کے نوالہ نہیں توڑتے ہوں گے۔ بلا وجہ کھنڈ اُلا الگ کر کے کیا کیجئے گا۔

" خیر..... تمھاری مرضی! "

جمیل نہا دھو کر فارغ ہی ہوا تھا کہ لالہ چاچا کا آدمی آ گیا۔ خیمے میں قدم رکھتے ہی بڑا داغ چوکا نظر آیا۔ رمضان سپاہی چینی کی پلیٹیں چن رہا تھا۔ شیشے کے گلاسوں میں پانی بھر کر وہ باہر چلا گیا۔ دوسری طرف سے چاچی آ گئیں۔ بھاری بھرکم جسم پر لہریا کنارے کی سفید دھوتی پیلے بھاگل پوری چادر اوڑھے بھاری بھاری زیور پہنے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی آئیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں وہ ان کے جسم سے اٹھتی ہوئی ماںتا کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

" کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا "

کسی نے کہا اور لالہ بیٹھ گئے۔ اندر سے گرم گرم پوریوں کی تھالی لپ جھپ آتی رہی۔

جمیل اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا کہ ایک شیریں آواز آئی۔

"نمستے!"

جمیل نے چونک کر اوشا کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے اسی طرح کھڑی رہی۔

"کیوں لالہ..... اوشا کی شادی میں تو بھیا آئے نہیں تھے۔"

"نہیں..... یہ چھٹیاں منانے نینی تال گئے تھے۔"

"لالہ نے ہاتھ روک کر جواب دیا۔"

"اس کی شادی بھی شیخ صاحب نے کی تھی۔"

"دوسری باتیں کرو دوسری..... عجیب واہیات عورت ہے۔"

چاچی بھڑکی کھاکر اپنی آنکھیں پونچھتی دوسری طرف چلی گئیں لیکن چاچی کے اس جملے نے فضا کی چہل پہل کو ڈس لیا تھا۔ اوشا پوری کی تھالی لے کر آئی۔ جمیل کے انکار پر ایسا تحکمانہ اصرار کہ اس نے پوری کو قبول کر کے پہلی بار اوشا کو نگاہ بھر کر دیکھا لیکن ان سیاہ، بیباک اور بے پناہ آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھکا کر نوالے بنانے لگا۔ ہاتھ بھر لمبے چاندی کے تھال سے بیڑا اٹھا کر اس نے پھر آنکھوں کو جسارت کی اجازت دی۔ پھر چاچی آگئیں۔ لالہ اپنی چھولداری میں قیلولہ کرنے لگے اور حقہ پینے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی چاچی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے درجنوں امراض اور لالہ کے چڑچڑے پن کا رونا رو کر اوشا کے موضوع پر آئیں جو اپنا پورا چہرہ کھولے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

" گھرانا بڑا اچھا ہے بیٹیا ..... لڑکا بھی سبھاؤ کا اچھا ہے ..... ویسے تو فوج میں ہوتے ہی ہیں سب لٹھ مار ...... ولایت پڑھنے گیا ہے آج کل .... تمھارے باپ کی خبر سُن کر کیسا کیسا بلکی تھی اوشا گر آنے نہیں دیا ان لوگوں نے ... برسی کے زمانے میں اس کے ولایت جانے کا معاملہ آن پڑا .. ارے یہ سمجھ لو بیٹیا ... کہ جس کو آنا کہتے ہیں تو آ ہی گئی ہے اوشا "

" مائی "!

" ہاں !"

" اب بھیا جی کو آرام کرنے دو .... اپنی باتیں تو میں خود کر لوں گی ان سے "

" ارے تو ہو گی لفٹیننٹ کی بیوی تو اپنے گھر میں ہو گی مجھ پر بابا کی طرح رعب مت جھاڑ .... ہاں نہیں تو "

جمیل اپنے شامیانے کے دوسرے درجے میں آیا جس کی پشت پر پھول داریاں لگی تھیں اور داہنی طرف کینوس کی دیوار کے پیچھے لالہ چاچا کا زنان خانہ تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر ہمیشہ کی طرح لیٹا لیکن نیند ہمیشہ کی طرح نہ آئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر اس نے یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ اس شور میں بھلا کوئی سو بھی سکتا ہے ؟ .... اس خیال کو تسلیم کر لینے کے باوجود اس کے دل میں ایک اندیشہ، ایک کانٹا کھٹک رہا تھا جس کا عرفان

جتنا ایک عام آدمی کے لیے آسان تھا اتنا ہی جمیل کے لیے مشکل تھا۔ عورت کے ہجر میں اس کی راتوں نے کبھی تارے نہیں گنے تھے۔ اس کے دنوں نے آبلہ پائی نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کی کسی گھڑی پر کسی عورت کی ایسی پرچھائیں نہ تھی جو خوابوں کے دیے جلاتی ہے ... جو آرزؤں کے گلاب کھلاتی ہے۔ اسے جس عورت کا سب سے پہلے نشاط انگیز تجربہ ہوا تھا وہ ایک ڈومن تھی جو بھام پور کے دسہرے کے میلے میں ناچنے آئی تھی۔ چمک دار کپڑوں اور کھنک دار زیوروں میں وہ ایک رانی کی طرح جھمک رہی تھی لیکن اس کے دیوانخانے کے وسیع ہال میں جب وہ رانی پہنچائی گئی تو کپڑوں کا کلابتو، زیوروں کا ملمع اور عارضوں کا غازہ چھوٹا پڑ گیا۔ وہ ایک خوبصورت بھکارن کی طرح دس روپوں کے لیے گڑگڑائی اور اس کے مخملیں جوتوں کو اپنے صندلیں ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ جمیل نے اسے روپے دیے اور چھوئے بغیر رخصت کر دیا۔ ہفتوں اس کی غلاظت کی وجہ سے جمیل کا جی متلایا کیا لیکن آج جب وہ اپنے ذہن کو گمراہی سے بچانے کے لیے ان کھیتوں کا تصوّر کرتا جن میں اس کا گیہوں لہلہا رہا تھا تو کسی مینڈھ سے ادشا اٹھتی اور کھیتوں کے سبز پس منظر میں اپنی تربوزی ساری اور سنہرے بدن کا جھکڑا اس ادا سے دکھلاتی کہ جمیل کی آنکھ جھپک جاتی۔ دل کی مٹی سے دفعتاً اُگ آنے والے شرمناک اور منہ زور خیالوں کو وہ اخلاق کے چابک مار مار کر رام کرتا اور اپنے ان اونچے اونچے بیلوں کا تصوّر باندھتا جن کا سارے جوار میں شہرہ تھا تو ان کی گردنوں پر رکھے ہوئے "ادھے" کا ریشمی پردہ پھڑپھڑاتا اور ادشا کی بے پناہ آنکھیں اس پر تڑپ کر گر پڑتیں۔ وہ اپنی نئی شیروانی کی گرد کی طرح ذہن سے خیالوں کو جھاڑتا اور

اپنے اس کچے بنگلے کے متعلق سوچنے لگتا جس میں مہندی کی باڑھوں کی دیواریں تھیں اور جن پر پھولدار بیلوں کا گتھا ہوا چھپّر پڑا تھا اور جس میں دروازوں کے بجائے پھولوں کی محرابیں کھڑی تھیں تو اس میں بچھی ہوئی نازک منقش مسہری کے مخملیں بستر سے اوشا انگڑائیاں لیتی اٹھتی اور اپنی سونے کی ٹھوس باہیں چمکاتی مسکراتی گزر جاتی۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا اور شامیانے کے سامنے ننھے سے صحن میں بچھی ہوئی ٹھنڈی چمکیلی دھوپ پر ٹہلنے لگا، ٹہلتا رہا۔

سورج غروب ہوتے ہی میلے نے دوسری کروٹ لی۔ میل بھر کے رقبے کے اندر کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا ہجوم چھوٹی سی جھیل میں ہزاروں پرندوں کی طرح کلبلانے لگا۔ آوازوں کا شہر آباد ہو گیا۔ روشنیوں کی بستیاں جگمگا اٹھیں۔ سینماؤں، نوٹنکیوں، ناٹکوں اور تماشوں اور خفیہ امراض کی دواؤں کے اشتہار اتنی تندی سے ہونے لگے کہ اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔

"بھیا جی کا بلاوت ہیں۔"

ایک ہی ٹھنی مہرن چٹکتی مٹکتی آئی اور گھنٹی سی بجا کر چلی گئی۔

چاچی چوکے پر سیاہ کامدار شال اوڑھے پیتل کا مندر نما پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ ان کے پہلو سے لگی زعفرانی ساری باندھے اوشا بیٹھی تھی۔ اس کی کندنی پیشانی پر یاقوت کا گول نگ رکھا تھا۔ اوشا نے نگاہ اٹھائی تو جیسے سیاہ گہری آنکھوں میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ پھر دور کہیں جاترنگ کی رسیلی دھن بجنے لگی۔

"بھیا جی ہمارا فیصلہ کرائیے۔"

اور جمیل کچھ کہنے کے بجائے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

" مائی اور ٹھکرائن چاچی سب لوگ سنیما دیکھنا چاہتی ہیں اور میں کلکتے میں روز روز دیکھ کر اکتا گئی ہوں تو آج کیوں نہ نوٹنکی دیکھی جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے بھیا!"

" رام رام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوٹنکی بھی کوئی تیرے دیکھنے کی چیز ہے؟"

" کیوں؟"

" ارے وہاں سب پاسی چمار دھنسے ہوں گے۔"

" ہاں! اور سنیما میں تو جیسے سب باہمن ٹھاکر براجمان ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ ارے مائی! یہاں کے سنیما میں تو سب بجر دیہاتی ہوں گے۔ بجر دیہاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گے بھیا!"

اور اوشا کی بولتی آنکھوں نے بڑے لاڈ سے تائید کی منت کی۔

" یہ بات تو ہے چاچی!"

" اچھا تو بڑی دلہن اور اوشا نوٹنکی دیکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم سب کیرتن کے بعد کھا پی کر سنیما دیکھنے جائیں گے۔ کوئی لالہ کو بلا لاؤ ذرا۔"

مسرور و شاداں جمیل نے رام سکھ کو حکم دیا کہ پانچ چھ سیٹیں رکوا لے۔

جب وہ اپنے پائجامے کی چوڑیاں دیکھتا اور شیروانی کا دامن برابر کرتا باہر آیا تو الاؤ کے گرد بیٹھی ہوئی بھٹارہ اور بھام پور کے آدمیوں کی بھیڑ کھڑی ہو گئی اور چلنے کی تیاری میں اپنی چادروں، مریٹھوں اور لاٹھیوں کو سنبھالا۔ پھر اندھیرے، ٹھنڈے اور کچے راستے پر اوشا آ گئی۔ اوشا کے پیچھے پکی عمر کی وہ دلہن تھی جو بھیا جی کے لیے بڑی تندہی سے پوریاں تلتی تھی۔ لالہ

سدگر کئی آدمیوں کے ساتھ سنر کھ کے شامیانے سے نکلے لیکن "بھیا" کے پیچھے ایک چھوٹے موٹے لشکر کو حرکت میں دیکھ کر چپ سادھے کھڑے ہو گئے۔ سرکھ کا میلہ اپنے مذہبی تقدس کے علاوہ بھی کئی باتوں کے لیے مشہور تھا۔ ہردوئی اور سیتا پور کے کھاتے پیتے بدمعاش چھوٹے چھوٹے داستوں میں پھنسے ہوئے مجمعے میں عورتوں کے ساتھ خوش فعلیاں تو کرتے ہی تھے لیکن موقع ہاتھ آجانے پر اٹھالے جانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شرفاء رات میں اپنی عورتوں کو باہر نکالنے سے گریز کرتے تھے یا پھر سخت انتظام کرتے تھے۔ جمیل اسی ماحول میں جوان ہوا تھا۔ وہ مرادآبادی برتنوں کی دکانوں کا پورا چکر لگا کر نوٹنکی کے شامیانوں کی پشت پر نکلنا چاہتا تھا اور سرکھ کے میلے کے سب سے چوڑے راستے پر اپنے آدمیوں کے حلقے میں رینگ رہا تھا۔ اپنی پشت پر ہاتھ محسوس کر کے اس نے گردن موڑی تو کندھے پر وہ دہکتی ہوئی آنکھیں رکھی تھیں۔

"ادھر سے چلیے"

اپنے بازو پر رکھے ہوئے ریشمی ہاتھ کو اس نے آہستہ سے تھپتھپایا اور رام سکھ کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے آدمیوں کا حلقہ مڑنے لگا جیسے کچے راستے میں نوے ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے موڑ پر اینٹوں سے بھری ہوئی لاری مڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب وہ اس راستے پر آ گئے جس کے دونوں طرف کھیل تماشوں کے تنبو لگے تھے اور جہاں مجمع تقریباً جم گیا تھا۔ وہ تھوڑی دور اور رینگ آئے۔ پھر بھیڑ کا ایک ریلا آگے سے آیا جسے اس کے آدمیوں نے کسی نہ کسی طرح سنبھال لیا۔ فوراً ہی دوسرا ریلا پشت سے آیا جس نے آدمیوں

کا حلقہ توڑ دیا۔ جمیل کے پاؤں زمین پر لگ نہیں رہے تھے اور دماغ آدمیوں کی بُو سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سنبھلنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا کہ وہ سیاہ مطمئن آنکھیں اس کے سینے پر چمک اٹھیں اور ریشمی ہاتھ اس کے بازوؤں پر جکڑ گئے پکّے ہوئے ہونٹوں نے لرز کر کچھ کہا لیکن شور کے طوفان میں غنچوں کی چٹک اپنی نمود کا اظہار کیے بغیر ڈوب گئی۔ جھرن ہرنی کی طرح سہمی کھڑی تھی۔ آدمی اسے اپنے گھیرے میں لینے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اوشا کے چہرے پر جمیل کی سانسیں اور گرم ہونے لگیں۔ پھر جمیل کے زندہ شریر ہاتھ سونے کی راکھ سے ٹھنسے ہوئے مخملیں پوروں پر پھسلنے لگے اور وہ دونوں کھڑے ہوئے اپنے اپنے خداؤں سے دُعا مانگتے رہے کہ ان لمحوں کے کچّے دھاگوں کو ابد سے باندھ دے۔ پھر بوڑھے رام سُکھ نے اپنے غول کو سمیٹا اور پورا زور لگا کر جمیل کی لبالب بھری ہوئی گاڑی کو دلدل سے نکال کر نوٹنکی کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا۔ جب ایک ملازم نے اندر چلنے کو کہا تب جمیل کو ہوش آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے اوشا کی طرف جُھکا تو کہ اوشا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیمپ چلیے ...... میرا جی الجھتا ہے۔"

رام سکھ نے شوقین لونڈوں کو نوٹنکی کے حوالے کیا اور خود بوڑھے بوڑھے آدمیوں کو ساتھ لے کر میل بھر کا چکّر کاٹ کر اُسے کیمپ پہنچا دیا۔ سترکھ کا مسلمان سپاہی کندھے پر بندوق دھرے تینوں کیمپوں پر پہرہ دے رہا تھا۔ پھر مانک پور کے خیمے کے پردے گرائے گئے۔ جلتی ہوئی لالٹینیں شرما گئیں۔ اوشا کی روشنی سے تنکا تنکا چمک اٹھا۔ جھرن نے کیتلی انگیٹھی پر رکھی اور چائے کے برتن میز پر جا کر سوالیہ نشان کی طرح کھڑی ہو گئی۔

"تم ورشن کر آؤ جلدی آنا۔"

وہ باہر نکل بھی گئی لیکن وہ دونوں اجنبی سے بیٹھے رہے۔ جمیل اوشا کی شمعی انگلیوں کے رنگین ناخنوں کی لویں دیکھتا رہا۔ آوازوں کے سمندر میں خیمہ خاموشی کا جزیرہ بنا کھڑا تھا، کھڑا رہا۔

پھر سارنگی کے تاروں کی طرح تنا ہوا سناٹا جمیل کے قدموں سے جھنجھنا کر رہ گیا۔ اوشا لب ہلانے کی جرأت کو آواز دیتی رہ گئی۔

ٹھنڈے خیمے میں لگے ہوئے نرم گرم بستر پر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔۔ اور کینوس کی دیوار کے اس طرف چوڑیاں باتیں کرتی رہیں۔۔۔۔ وہ ان کی اجنبی بولی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

صبح ناشتے پر جمیل نے کنکھیوں سے ان ناآشنا آنکھوں کی بے پروا نگاہوں کو ٹٹولا جو رات کا خواب کہیں بھول آئی تھیں۔ چاچی رات کے تماشے کے واقعات دہراتی رہیں اور اپنے سارے بدن کے ساتھ ہنستی رہیں۔ جمیل ان کا رسماً ساتھ دیتا رہا اور اپنے خیالوں کے سنہرے دیس میں بھٹکتا رہا۔ اوشا گرہستن کی پوری گمبھیرتا کے سارے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ادھر سے اُدھر آتی جاتی رہی۔

وہ ٹھاکر کے خیمے میں بیٹھا ہوا میلے کے انتظام پر گفتگو کر رہا تھا جب باسی نے امّی

کا خط لا کر دیا۔ طلبی کا حکم پڑھ کر اور ٹھا کر سے اجازت لے کر وہ لالہ بابا کے یہاں آیا اور ان کو خبر سنائی اور سوار ہونے سے پہلے وہ چاچی سے ملنے کے بہانے پھر خیمے میں گیا لیکن وہ ایک وسیع قبر کی طرح خاموش تھا۔ اوشا سے بغیر ملے وہ سوار ہو گیا، اس نے آنگن ہی سے دیکھا کہ دالان میں زمین پر چاندنی بچھی ہے۔ گاؤ سے ٹیک لگائے فقیر ماموں بیٹھے ہیں۔ حاجی صاحب دیوی شریف کے سچّے مرید کی طرح گیروے رنگ کی موٹی چادر آدھی باندھے آدھی اوڑھے ہوئے۔ سیاہ داڑھی سینے پر اور سیاہ پٹے شانوں پر لہراتے ہوئے فقیر ماموں برسا برس کے بعد کہیں اپنی بہن کے یہاں چکّر لگاتے تھے لیکن ان کی آمد ہمیشہ سیاسی ہوا کرتی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھا ہوا رسمی باتیں کرتا رہا اور ان کی منقش کھڑاؤں کے نقوش گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ فقیر ماموں کس کس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہاں آسکتے ہیں۔ پھر جب وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا تب کسی نے اطلاع دی کہ باہر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ منشی بلجز قصاب کی صورت دیکھ کر اس کی بھویں تن گئیں۔ منشی دوسرے بوڑھے بوڑھے آدمیوں کے ساتھ سلام کر کے اس کے بیٹھنے تک کھڑا رہا پھر بغیر اجازت لیے تخت پر اطمینان سے جم گیا اور چبلا چبلا کر بولا۔

"کچھ مولبی صاحبان شہر سے آئے ہیں۔ عشا کی نماز کے بعد وعظ دیں گے۔ ان کے کھانے دانے کا بندوبست میں نے کیا ہے۔!"

دوسرے بزرگ نے گرم گرم ملا کر کہا۔

"حاجی کی درخواست ہے کہ آپ بھی مولبی صاحبوں کے ساتھ کھانا کھالیں۔"

"میں مسرکھ سے آرہا ہوں .... تھکا ہوا ہوں .. کھانا وانا نہیں کھاؤں گا۔"

"آپ جو پرہیزی کھائیں وہ پکایا جائے۔"

"جی .... جھام پور میں جکوؤں دھنیوں کے یہاں ٹھہرنے والے مولویوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ میں ان کی سلامی مجرئی کرنا پسند کرتا ہوں .... سُنا آپ نے؟"

"جی!"

"جا سکتے ہیں آپ۔"

عصر کی نماز کے وقت جب وہ ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو جگیر کاٹ کرنشی کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ اس کے دروازے پر مُسلم لیگ کا جھنڈا لگا تھا اور چبوترے سے لے کر چھپّر تک میلا میلا فرش بچھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بستی کے بزرگ مُسلمان بیٹھے تھے۔ ان کے جلوس کئی اجنبی صورتیں داڑھیوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ گزرا تو کئی آدمیوں نے کھڑے ہو کر اسے "سلام" کے بجائے "سلام علیکم" کہا جس کے جواب میں اس نے ہمیشہ کی طرح سر کو جنبش دی۔ تھوڑی دور پر اس نے سُنا کوئی اجنبی آواز سلام کرنے والے اور سلام کا جواب قاعدے کے مطابق نہ دینے والے پر تنقید کر رہی تھی۔ وہ ذرا سا جھنجھلایا پھر ان ناگوار خیالات کو ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ آبادی ختم ہو گئی تھی۔ دُور دور تک ربیع کی فصلوں کے فرش لگے تھے۔ اونچے درخت خادموں کی طرح سبز وردیاں پہنے

حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ وہ اس سیدھی سنسان نہر پر ٹہلتا رہا جو مانگ کی طرح نکلی ہوئی تھی۔
جب وہ واپس آیا تو اس نے ڈگّی پٹنے کی آواز اور وعظ کا اعلان سُنا۔

فقیر ماموں کے ساتھ کھانا کھا کر جب وہ اپنے کمرے میں آگیا اور فقیر ماموں عشا کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلے گئے تب امّی آئیں اور اس کے پاس ہی مسہری پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئیں۔

"فقیر بھائی نے آج پھر مجھ سے کہا ہے۔"

"جی!"

"بڑے بھیّا کی لڑکی کے لیے۔۔۔ ماشاء اللہ جوان ہوگئی۔ صورت سیرت دونوں میں ایک ہے۔۔۔ میں۔"

"آپ نے کیا کہا ان سے؟"

"میں۔۔۔ میں کیا کہتی۔۔۔ میں نے وہی کہا جو تمہارے باپ نے مرنے سے پہلے کہا تھا۔۔۔ وہ تو تاریخ کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ فی الحال ٹال دیجئے۔۔۔ امّی!"

"کیا؟"

"میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی لیکن۔۔۔ ابھی ٹال دیجئے۔"

وہ بڑی دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور نجمہ کو دیکھتا رہا جو اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے شیریں ناگواری کے ساتھ پھوپھی جان کو پکار رہی تھی کہ دیکھئے جمّو بھیّا مجھ کو گدگدا رہے ہیں۔۔۔۔ میری مہندی خراب کیے دے رہے ہیں۔ پھر اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ بھنچ گئے

کمرے کا کوئی دروازہ کھول کر ادشا آگئی اور اپنے کمر تک لہراتے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اس کی پٹی پر اداسی سے بیٹھ گئی۔ جمیل کا جی چاہا کہ نجمہ کی چٹیا پکڑ کر باہر نکال دے اور کمرے کی ہاتھ بھر لمبی موٹی زنجیر لگادے۔ نعرۂ تکبیر کی آواز سن کر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر آیا۔ پہرے کا پاسی بلّم لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ساتھ ہو گیا۔ جامع مسجد کے سامنے میدان میں شامیانہ لگا تھا۔ نیچے اُس فرش بچھے تھے۔ گیسیں جل رہی تھیں۔ پیچھے بیٹھی ہوئی عورتیں لڑ رہی تھیں اور بچے کو چپ کرانے کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ ایک مولوی صاحب سر پر عربی رومال باندھے ہوئے پوری آواز سے پاکستان کے فوائد بیان کر رہے تھے۔ وہ درختوں کے اندھیرے میں ٹہلتا رہا اور تقریر سنتا رہا۔

صبح کو جب وہ فقیر ماموں کو روکنے کے لیے اصرار کرتے کرتے تھک گیا اور مجبور ہو کر ان کو بھیجنے کے لیے باہر نکلا تو اَن گنت مکانوں کی منڈیروں پر بانسوں اور سینگھوں میں لگے ہوئے مسلم لیگی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس دن اس نے جھام پور کو ایسی خالی خالی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی بستی میں بھٹک کر آگیا ہو۔ وہ دیر تک اپنے جوڑی دار یا بجاتے کی جوڑیاں دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ ادّھے میں جُڑے ہوئے بڑے بڑے بیل بھنبھناتے رہے اس کے نوکر ان کو گالیاں دے دے کر سنبھالتے رہے اور وہ غور کرتا رہا کہ وہ اپنی قوتِ فیصلہ کہاں رکھ کر بھول آیا ہے آخر ادشا کو دیکھنے کی خواہش سے دست بردار ہو کر اس نے ادّھا کھول دینے کا حکم دیا اور دیوان خانے میں بچھی ہوئی مسہری کے ٹھنڈے تالین پر لیٹ گیا۔

جس دن مانک پور جاتے ہوئے لالہ چاچا جھام پور سے گزرے تو اس نے ان کا ادّھا

روک لیا اور پردہ اٹھا کر چاچی سے اُترنے کو کہا۔ چاچی نے خانگی مصروفیات کا بہانہ کر کے
اوشا کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اگر چاہے تو شام تک کے لیے ٹھہر جائے اور جمیل کے
پہلی ہی بار کہتے پردہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ پھاٹک پر ادّھا لگایا گیا اور امّی نے اوشا کو
اتار لیا۔ وہ مسکرا مسکرا کر امّی سے باتیں کرتی رہی۔ جمیل تھوڑا توقف دے کر اندر آیا اور اسے اپنا
نیا ریڈیو سنوانے کے لیے باہر لے آیا۔ ڈیوڑھی پر پہنچتے ہی امّی نے آواز دی کہ نوکر دیوان خانے
میں نہ جانے پائیں اور پھاٹک بند کرا دیا جائے۔ جب جمیل نے ہال کی چلمن اٹھا کر اوشا
کو آگے بڑھنے کا مہذّب اشارہ کیا تو اس نے تیکھے تیوروں سے جمیل کو دیکھا اور بولی۔

"میں اتنی بُری لگتی ہوں آپ کو"

"کیا؟"

جمیل کو ایسا لگا جیسے کہانیوں کے اس بدنصیب انسان کی تقدیر بدل گئی ہو جو بھیک مانگنے کسی شہر میں صبح ہی صبح داخل ہوا اور شہر والوں نے اسے پکڑ کر بادشاہ بنا دیا ہو۔

"اگر آپ آنے کے لیے کہتے تو میں باندھ کر نہ روک لیتی"

"یہ آپ ٹکر ٹکر کیا دیکھے جا رہے ہیں کچھ منہ سے بولیے"

"میں کیا بولوں ..... میں بولنے کے قابل کہاں ہوں .... میں اگر اپنی مرضی کے مطابق کچھ ہو سکتا .... تو آج تم میرے گھر میں اس طرح نہ آتیں جس طرح آئی ہو"

"پھر کس طرح آتی؟"

اس کے لہجے پر آشتی کی قلعی تھی۔

"تم ..... تم اس طرح آتیں ..... کہ یہاں شامیانے لگے ہوتے ..... دیغیں نچ رہی ہوتیں ... رنڈیاں ناچ رہی ہوتیں ۔ اندر عورتیں بھری ہوتیں اور باہر آدمی۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی ہوتی اور مانگ میں موتی، اور تم اتنی عورتوں میں گھری بیٹھی ہوتیں کہ تم سے میں ملنے کے ہزار جتن کر کے بھی نہ مل پاتا۔"

اوشا نے ہلکے سے اپنے ہاتھ چھڑا کر ریڈیو آن کر دیا۔

"لیکن میرے راستے میں ایسی ایسی سنگین دو دیواریں کھڑی ہیں جن کے توڑنے کے لیے پورے دو جنم بھی تھوڑے ہیں۔"

پھر اوشا بٹیا کو پکارتی ہوئی جہاندیدہ اتی اندر آ گئیں۔

عصر کی نماز کے وقت سے اوشا چلنے کے لیے بظاہر بے قرار ہونے لگی اور جمیل خوبصورتی سے ٹالتا رہا۔ جب گلابی دھوپ اونچی اونچی دیواروں سے بھی پرے چلی گئی تب دروازے پر ادھے لگائے گئے اور جمیل پوری بے نیازی کے ساتھ اوشا کے ادھے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے پر آدمی بیٹھ گئے۔ جب سرمئی فضا کا رنگ گہرا ہو گیا اور بھام پور کی بستی پیچھے چھوٹ گئی تب بھاگتے اور ہچکولے کھاتے ادھے میں اوشا کا ماہتاب سا چہرہ اس کی گود میں ڈھلک آیا اور وہ آسمانوں پر پرواز کرتا رہا۔

پھر وہ الکشن آ گیا جس نے ایک دل، ایک جان، ایک زبان، ایک تہذیب،

ایک تاریخ اور ایک ملک کو تقسیم کر دیا۔ کئی دن پہلے سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منشی بجر قصاب دیکھتے دیکھتے حاجی صاحب بن گئے۔ گوشت کی دکان بند کر کے لانبا کرتا اونچا پائجامہ پہن کر وہ آنے والے مولویوں کی مدارات کرنے لگے۔ چھپّروں میں گردش کرتے ہوئے حقوں کی گڑگڑاہٹ، پاٹ دار قہقہے، ناقابلِ یقین داستانیں اور خون خراب کر دینے والے لطیفے سب معلوم نہیں کہاں ہجرت کر گئے۔ ساری آبادی پر ایک جوشیلے تیوہار کی سی فضا طاری ہو گئی۔ شادی بیاہ میں پہنے جانے والے دھرا و کپڑے پٹاروں اور ٹین کے بکسوں کا منھ کھول کر نکل آئے۔ رنگ اڑے صافے، سال خوردہ جامدانی کے پلّے اور بوسیدہ اچکنیں پھڑپھڑاتی ہوئی دیکھی جانے لگیں۔ مسجدوں میں میلے لگے رہنے لگے اور جمیل چہروں کی کتابیں پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پانے لگا۔

پھر وہ رات آ گئی جس کی صبح کو جھام پور میں ووٹ پڑنے والے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ جمعیۃ العلماء کے ایک ٹوٹے پھوٹے مولوی سے باتیں کر رہا تھا کہ چار چھ جسیم مولویوں نے اسے گھیر لیا اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسی میں قوم کی فلاح ہے۔۔۔۔۔ اسی پر قوم کا اتفاق ہے۔۔۔ وہی قوم کا مقدر ہے۔۔۔ جمیل اسکول کے طالب العلموں کی طرح خاموشی سے ان کی تقریریں سنتا رہا۔ پھر جب وہ بکھنے لگے تب اس نے اپنی ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ اٹھایا اور مضبوط آواز میں بولا۔

"یہ میں جانتا ہوں کہ میں قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتا اور اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قصبے میں جہاں میرے آباواجداد کی ہڈیاں دفن ہیں مسلم لیگ کو شکست ہوگی۔

اس لیے کہ میں اس کو ووٹ نہیں دوں گا۔"

صبح ہوتے ہی مڈل اسکول کی وسیع عمارت کے احاطے میں جمیل کی آرام کرسی ڈال دی گئی اور اس کے نوکروں کا دستہ اجلے کپڑے پہن کر کھڑا ہوگیا۔ ووٹ پڑنے سے تھوڑی دیر قبل جمیل آیا اور اس کرسی پر دراز ہوکر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ آہستہ آہستہ حاجی منشی کا سامیانہ اجڑنے لگا اور جمیل کی کرسی کے نیچے بچھے ہوئے عیدگاہ کے فرش پر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ سیتاپور سے آئے ہوئے مولوی صاحبان نے طاقتِ لسانی کے سارے جادو جگائے، ایک ایک سبق کو آموختہ پڑھا ایک ایک مضمون کو دس دس رنگ سے باندھا مگر جمیل کے سائے میں بیٹھی ہوئی اکثریت کے کان پر جوں نہ رینگی ـــــ

ابھی "فتح" کا اعلان کرنے والے لوگوں کے فلیتے گرم تھے کہ اس "فساد" کی ہیجان انگیز خبریں آنے لگیں جس کی سرخی کے لیے کروڑوں دلوں نے اپنے لہو کی سبیل لگائی تھی۔ سیتاپور کے بازار سے آنے والے اخبار لاتے جسے ایک پڑھتا اور سو سنتے اور دو سو سنی ہوئی خبروں کو نمک مرچ لگا کر دوسروں کو سناتے اور چٹخارے لیتے۔ پھر مسجدوں کی صفوں پر جنازے کی نمازوں کا گمان ہونے لگا۔ میلاد شریف کی محفلوں پر چہلم کے فاتحوں کا شک ہونے لگا۔

جمیل کے ذہن پر ہتھوڑے چلتے رہے۔ اعصاب پر ٹوٹ جانے والے تار کا تناؤ رہنے لگا۔ جب بوڑھے بوڑھے چہرے خوف کے وظیفوں کا ورد کرتے اس کے پاس آتے

تو وہ بے خوف آواز میں ان کی دلداری کرتا ان کی ڈھارس بندھاتا لیکن جب وہ چلے جاتے تب وہ خوف سے لرز لرز اٹھتا۔ ایک صبح وہ ناشتہ کرکے باہر آیا۔ ہال میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ پھاٹک پر مانک پور کا ادھا کھولا جارہا ہے۔ پھر آدمی اپنے اپنے منہ گھما کر کھڑے ہو گئے اور اوشا برآمد ہوئی۔ وہ سیدھی اسی کے پاس چلی آئی اور جمیل نے دیکھا کہ ان بے جھپک آنکھوں پر سوچنے کی عادت نے اپنے ہالے ڈال دیے ہیں اور قاتل نگاہوں کی دھار اتر گئی ہے اور اوشا نے اس کی بے خواب آنکھوں میں وحشت کی پرچھائیاں دیکھ لیں۔

"اپنی آنکھوں سے تمھیں بخیریت دیکھنے کے لیے میں نے کتنی بار تم کو بلایا۔"

"میں تو مانک پور آتا.... لیکن یہاں یہ خبر اڑ جاتی کہ میں پاکستان چلا گیا ہوں اور پھر معلوم نہیں کیا ہوتا۔"

"میں تو اخبار پڑھ پڑھ کر پاگل ہوئی جاتی ہوں۔"

"میرے پاگل پن کو سمجھنے کے لیے اپنے پاگل پن کو کم سے کم دس سے ضرب دیدو۔"

"میں ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"تم پاکستان چلو۔"

"پاکستان.... تم پاکستان جانے کو سسر گھر جانا سمجھتی ہو کہ میرے منہ سے ایک لفظ نکلا اور وہاں خیمے برپا ہو گئے، باورچی خانہ قائم ہو گیا، پہرہ کھڑا ہو گیا۔ پاکستان

جانے کا مطلب ایک نیا جنم ہے، ایک بن باس ہے جس کو جھیل لے جانے کی میں اپنے آپ میں طاقت نہیں پاتا۔"

"تم خوب سوچ لو۔"

اور اتنے دنوں میں نے کیا کیا ہے؟ تم یہ مکان دیکھتی ہو..... یہ جائداد دیکھتی ہو، یہ نوکر چاکر دیکھتی ہو لیکن تم یہ نہیں دیکھتیں کہ میری ایک بیوہ پھوپھی ہیں جو اپنے پاندان کے لیے میرا منہ دیکھتی ہیں، ان کے پانچ بچے ہیں جو اسکول کی فیس کے لیے میرا دامن پکڑتے ہیں، میری ایک چچی ہیں جن کی دو بیٹیاں ہیں.... جو تم سے بڑی ہیں، جو مجھ سے بڑی ہیں جن کی جوانی شادی کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہے۔ اس بستی کے بوڑھے بوڑھے آدمی ہیں جن کے سروں پر بہت سی دوسری تلواروں کے ساتھ ایک تلوار یہ بھی لٹک رہی ہے کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں...... اور یہ مسجدیں ہیں جن میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑھی لیکن یہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی ہیں.... یہ درگاہیں ہیں جن پر کبھی میں نے فاتحہ نہیں پڑھا لیکن ان کی حفاظت میرا فرض ہے.... میں کہاں جاؤں.... میں ان سب کو کہاں لے جاؤں؟ کاش میں رئیس بھام پور کے گھر کے بجائے کسی مزدور کے گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ صبح سے شام تک ڈلیا ڈھوتا اور رات کو چونی کی روٹی اور چولائی کا ساگ کھا کر یاٹ دار آواز میں برہا گاتا اور سو جاتا۔"

اس کی آواز بھرّا گئی...... اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اوشا اپنی کرسی سے اٹھی۔ اپنے آنچل سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔

"تم نے میری بات کو دھیرج سے نہیں سُنا۔ ۔ ۔ ۔ تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ ۔ ۔ ۔ جسم تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ میں ادشا نہیں رہوں گی۔ ۔ ۔ ۔ میں نجمہ ہو جاؤں گی۔ ۔ ۔ ۔ بن باس تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ تم چودہ برس میں چودہ دفعہ آسکوگے۔ ۔ ۔ ۔ میں مر کر بھی یہاں نہ آسکوں گی۔"

"تم!"

"ہاں۔ ۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ میں سونا نہیں نیم کی لونگیں پہنوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ریشم نہیں ٹاٹ پہنوں گی۔ وہ بھی جب تمہاری ماں پہن لیں گی۔ ۔ ۔ تمہاری ماں سے بچ رہے گا۔"

پھر ادشا بیٹی کو پکارتی ہوئی امّی آگئیں۔ ان دونوں نے گھبرا کر اپنی اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اپنے چہروں پر بحالی کے نقاب ڈال لیے۔ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی سرخی لگالی۔

جاگتے جاگتے رات کی آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ سوچتے سوچتے دن کے اعصاب شکستہ ہو گئے، مگر دل کی بیقراری کو کسی کروٹ کسی صورت قرار نہ آیا۔

چیت آگیا۔ فصل پک کر تیار ہو گئی۔ سیر بانوں نے کٹو لینا شروع کر دیا۔ جب مڑنی چلنے لگی غلّہ اوسایا جانے لگا تب بہت اصرار کے بعد جمیل اپنے پھاٹک کے باہر نکلا۔ دن دوپہر سنسان بستی میں لٹکے ہوئے چہروں اور سوجی ہوئی آنکھوں کے سلام لیتا ہوا کھلیان پہنچا تو مدتوں کے بعد فضا کچھ چونچال نظر آئی۔ دراز گھونگھٹوں میں تبسم کے چراغ جل رہے تھے۔ سیاہ لہنگوں کے جھول میں پنڈلیوں کی مشعلیں روشن تھیں۔ دور تک

سنہرے اناج کے ٹیلے کھڑے تھے جن کے نظارے نے آنکھوں کو مست کر دیا تھا شوخ
لڑکے چہلیں کر رہے تھے۔ بڑے بوڑھے ان کو گھڑک کر جمیل کی موجودگی کا احساس
دلا رہے تھے جو سینے پر بازو باندھے ٹہل رہا تھا۔ پھر ایک سپاہی گھڑے میں گوبر گھول کر
لایا اور دوسرے نے لکڑی کا چھاپا اس میں بھگو بھگو کر اس کو چھاپ دیا۔ وہ نہر میں
نہاتی ہوئی عورتوں کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے گھر آیا۔ جانماز پر بیٹھی ہوئی امّی نے اسے
اشارے سے بلایا اور بڑے ماموں کا پاکستان سے آیا ہوا خط پکڑا دیا۔ وہ سارے
خاندان کے ساتھ پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ان کا لڑکا سکریٹریٹ میں ملازم ہو گیا۔ ان
کو کراچی میں کوٹھی الاٹ ہو گئی تھی اور اب جمیل کی آمد ان کی زندگی کی آخری آرزو بن کر
رہ گئی تھی۔ یہ رات جمیل پر اور بھاری گزری۔ پنکھا کھینچنے والا خدمت گار اسٹول پر
بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فقیر ماموں زعفرانی رنگ کی آدھی چادر
باندھے آدھی اوڑھے نم گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے ہیں۔ ایک ہاتھ ان کی تسبیح گھما
رہا ہے، دوسرا آنسو پونچھ رہا ہے۔ بڑے ماموں کا منکا ہاتھی دیوان خانے کے چبوترے
سے لگ کر بیٹھ رہا۔ ڈیوڑھی سے امّی کی سسکیاں آ رہی ہیں۔ بڑے ماموں کا خاص خدمت
گار رومال سے چاندی کے روپے نکال نکال کر اس کے نوکروں میں تقسیم کر رہا ہے —
بڑے ماموں نے اسے سینے سے لگا کر آنسو بہاتی آواز میں دعائیں دیں اور کھڑے پر چڑھ
کر بیٹھ گئے۔ پھر امّی کی بھیجی ہوئی چھوٹی تیلن آئی۔ اس نے ہاتھی کے پاؤں پوجے اور ہاتھی
اپنے گھنٹے بجاتا ہوا گراند یل پھاٹک سے گزر گیا۔ ... پھر ایک دھان پان سی لڑکی

جڑاؤ زیور میں گوندھی ہوئی ..... سچے کام کے ریشم میں ڈوبی ہوئی پازیب کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بجاتی ہوئی آئی۔ جھومر سے لدا ہوا سر اوپر اٹھایا .... آنسو اور کاجل لگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ جگمگاتے ہوئے ہاتھ نے پیشانی پر چمکتے ہوئے ٹیکے کو چھو لیا..

.... اور جمیل اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا..... بیٹھا رہا....

امّی کی تہجّد کی نمازوں کا سلسلہ فجر تک تو دراز ہو ہی چکا تھا اب وہ اکثر اوقات جانماز ہی پر بیٹھی رہتیں۔ سفید ہاتھوں میں سفید آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگا کرتیں اور کبھی کبھی ایسی آہ بھرتیں کہ عورتوں کے ہاتھ سے برتن چھوٹ جاتے۔

نوچندی جمعرات کی رات کو جب جمیل کھانے پر بیٹھا تو امی اپنی پلیٹ میں چمچہ بھر شوربا لیے بیٹھی رہیں اور اس کے اصرار پر بھی لقمہ نہ توڑا۔ وہ کھانا کھا کر باہر چلا گیا۔ پھر بستر پر لیٹ کر انتظار کرتا رہا لیکن بڑی دیر کے بعد بھی امّی نے اسے قرآن کی آیتیں دم کرنے کے لیے نہ بلایا اور انتظار کر کے وہ دبے پاؤں گیا اور ڈیوڑھی سے اس نے دیکھا کہ صحن میں چوکی پر امّی سجدے میں پڑی ہیں۔ اسٹول پر چینی کی بیٹھک کا لیمپ پوری روشنی سے جل رہا ہے۔ وہ واپس چلا آیا۔ پھر صبح صادق کے وقت جب رحمت کے فرشتے اس عالمِ خاکی پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اس بدحواسی سے اندر بھاگا جیسے چڑیلیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ اونگھتے ہوئے پہریداروں نے کڑکدار آواز میں

جاگتے رہو کا نعرہ لگایا اور اس کے پیچھے پیچھے خلافِ معمول کھلی ہوئی ڈیوڑھی تک آگئے۔
جمیل نے سجدے میں پڑی ہوئی امّی کو کانپتے ہاتھوں سے کھسوٹا لیکن امّی اس مقدس رات
میں آسمان سے آنے والی روحوں کے ساتھ کب کی پرواز کر چکی تھیں۔ جمیل کی چیخ سے سارے
جھام پور کی نیندیں پرواز کر گئیں۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔
چہلم کے فاتحے کے دن اندرونی عمارت کے طویل دالان میں لوبان اور اگر کی خوشبو
کے مرغولوں کے درمیان نابینا حافظ نے پرسوز آواز میں تلاوت کلام پاک شروع کی تو
ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ جمیل کانپنے لگا...... ایسی رقت طاری ہوئی کہ جمیل رونے لگا۔

پاکستان سے آئے ہوئے ایک موٹے موٹے لفافے کو کھولتے ہی ایک تصویر میز
پر گر پڑی۔ نجمہ، دلہن بنی ہوئی نجمہ ایک خوش رو دولھا کے پہلو سے لگی شرما رہی تھی۔
جمیل نے نجمہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا لیکن ان شاداں آنکھوں میں اس سے بچھڑنے
کے دکھ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بڑے ماموں نے اپنی ساری وضعداری
کو بالائے طاق رکھ کر بڑے چھچھورے پن کے ساتھ اس کے منہ پر تھپیڑ مارا ہے اور اس کی رگوں
میں سانس لیتی ہوئی خاندانی انانیت زخمی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔ اس نے ان کے لمبے
چوڑے خط کو پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نجمہ کی تصویر اس طرح اٹھا کر پھینک دی جیسے وہ
تصویر تصویر نہیں بلکہ خود نجمہ ہے۔ پھر اس نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنی کنیز زمینوں کا حساب

لگایا اور اپنی پھوپھی، اپنی چچی اور ان کی اولادوں میں تقسیم کر دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ ان لوگوں کی روٹیوں کے بندوبست کے خیال سے اسے بڑی تسکین ہوئی۔ پھر اس نے قصائی کی طرح اپنے درجنوں جانوروں کو ٹٹولا، لکڑی کاٹنے والوں کی طرح اپنے مشہور باغوں کا کنکوت کیا، سُناروں کی طرح اپنی امّی کے موٹے موٹے خاندانی زیوروں کو اچھال اچھال کر پرکھا اور بنیوں کی طرح اپنے باپ کے روپے کو بجا بجا کر گِنا۔۔۔۔ پھر پورے سکونِ قلب کے ساتھ اس نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا کہ اسے پہلے مشرقی پاکستان جانا چاہیے یا سیدھے کھوکھراپار ہو کر گزر جانا چاہیے۔۔۔۔۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا اور برسوں کی ریاضت کے بنائے ہوئے عینیت کے بُت ایک ہی دھماکے میں چور ہو کر رہ گئے۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے کمبل کو برابر کر کے اس نے کھڑکی کا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا سے کمرہ لبریز ہو گیا۔ نیم کی تازی مسواک لانے والے آدمی کے ساتھ مانک پور کا سپاہی بھی کٹھری میں لپٹا ہوا سوں سوں کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے اس کے ہاتھ میں بادامی کاغذ کا پرزہ پکڑا دیا۔ اس نے بھویں سکوڑ کر بچوں کی طرح ہجّے لگا لگا کر معلوم کر لیا کہ اوشا نے اسے فوراً بلایا ہے۔ مسواک ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ادھّا کھینچنے کا حکم دیا۔

جب اس کا ادّھا بھیل کے کنارے مانک پور کے باغ سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ مانک پور کے بڈھے مختار ایک پیڑ کی جڑ پر بیٹھے ناریل پی رہے تھے۔ قریب پہنچنے پر انھوں نے فرشی سلام کیا۔ ملازم نے ادھّا روک لیا۔ پتہ چلا کہ مختار رئیس کے داماد کو شکار

کھلا رہے ہیں۔ مختار کے ہاتھ کی سیدھ میں جمیل نے دیکھا کہ ایک موٹا موٹا بے ڈھنگا آدمی خاکی نیکر پہنے چھچلے چھچلے پانی میں بندوق لیے کھڑا ہے۔ جمیل نے اوشا بڑھانے کا اشارہ کیا۔ لالہ قد آدم چبوترے پر تلسی کے پیڑ کے پاس بیٹھے سندھیا کر رہے تھے۔ داماد کی خاطروں کے انتظام میں بولائی ہوئی چاچی اس سے رسمی باتیں کر کے چلی گئیں۔ اوشا اکیلی رہ گئی۔

"تم کو مبارک ہو۔"

جمیل نے قالین کے پھولوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم کو بھی مبارک ہو۔"

"وہ کیوں؟"

اوشا کی آواز میں غم کی تھرتھراہٹ محسوس کر کے اس نے پوچھا۔

"میں جو آپ کو پریشان کیا کرتی تھی ... کل ننک مانک پور سے چلی جاؤں گی۔ پھر کب آؤں گی، مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔" اور اس نے جمیل کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں۔

"اسی دن کے خوف سے تو میں تم سے دور دور رہنا چاہتا تھا ... تم نے یہ میرے ہاتھ دیکھے ہیں؟"

اوشا نے اس کا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں کی گود میں لے کر بھینچ لیا۔

"یہ ہاتھ بڑے خوش نصیب ہیں۔ انھوں نے سونے کو چھوا تو وہ مٹی ہو گیا ...

یہ پارس ہیں.... ابھی کل رات میں نے سوچا تھا کہ اپنی تاریک زندگی کے کالے کوسوں کو تمہاری روشنی کی رفاقت کے سہارے کاٹ لے جاؤں گا.... تمہاری قربت کے مرہم سے سب زخم بھر جائیں گے، سب داغ بجھ جائیں گے۔"

پھر عورتیں آ گئیں اور وہ تنہائی کے انتظار میں چپ ہو گیا لیکن تنہائی سے پہلے لالہ جی آ گئے جمیل بیٹا پکارتے ہوئے۔ باہر دھوپ میں کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر لیٹا ہوا تھا دوسری پر گندے پاؤں رکھے تھے۔ دھوپ میں چاند چمک رہی تھی۔ اس نے جمیل کے سلام کے جواب میں اپنے آپ کو تھوڑا سا ابھارا اور گوشت اور بالوں سے لدا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جمیل نے جھک کر ہاتھ ملایا اور وہ دوسری کرسی پر بے دلی سے بیٹھ گیا۔ لالہ چاچا کی پیشانی پر اس بد تہذیبی سے شکنیں پڑ گئیں اور وہ ہر دو اہوں کو تیخ تیخ کر ہدایتیں دینے لگے۔ اس نے جمیل پر رعب ڈالنے کے لیے چرمی بیگ سے پائپ نکالا اور تمباکو بھرنے لگا۔

"آپ 'اسموک' کرتے ہیں؟"

"جی ہاں.... لیکن لالہ چاچا کے سامنے نہیں کرتا۔"

"اچھا!"

وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔

"آج کیا مارا آپ نے؟"

جمیل خاموشی سے اکتانے کے بجائے اپنے جانسوز خیالوں سے اپنے ذہن کو بھٹکانے

کے لیے بات کرنا چاہتا تھا۔

"آپ کے یہاں چڑیا ہے وے نہیں"

"اس ضلع میں میرا علاقہ چڑیوں کی کان سمجھا جاتا ہے"

"تو پھر میرا خیال ہے کہ دیہاتی شکاریوں نے اندھا دھند فائر کر کے چڑیوں کو بھڑکا دیا ہے ..... آدمی کی داب ہی نہیں سہتیں"

اگر مجھ کو آپ کی آمد کی اطلاع ہوتی تو چڑیوں کو بند ھوا کر جھیل میں ڈلوا دیتا۔"

جمیل اس کے بات کرنے کے انداز سے جھنجھلا گیا تھا۔ جلد پورا کرتے ہی وہ اٹھا اور اپنے آدمیوں کو ادّھا کھینچنے کا حکم دیا۔ لالہ چاچا اسے کھانے کے لیے روکتے ہوئے ادّھے تک آئے لیکن وہ سوار ہو گیا۔

جولائی کی پہلی تاریخ کو جھام پور کے پٹواری پنڈت درگا جرن بغل میں بستہ دبا کر آئے اور دیوان خانے کے دالان میں پڑے ہوئے ننگے تخت پر بیٹھ گئے اور جب جمیل برآمد ہوا تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح زمین کو چھوتا ہوا سلام کیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد تخت کے کونے پر ٹک گئے۔ پھر مرمری آواز میں انھوں نے زمینداری کے خاتمے کا اعلان کیا اور کہا کہ مجھے حکم ہے کہ میں ڈگی پیٹ کر اس خبر کو مشتہر کروں۔ جمیل نے بھنگیوں کو بلوایا اور اصرار کر کے اپنے پھاٹک کے سامنے ڈھیرا پٹوا کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کرایا۔

اس دن سے جمیل کے نوکر نے بازار کے بھاؤ سے گوشت خریدا، اس کے بیر داروں نے سرکاری کھیتوں میں چلتے ہوئے آسامیوں کے ہل کھلوا دیے۔ کٹھار کی مرمت کرتے ہوئے مزدوروں کو پوری مزدوری دی گئی۔ دوسرے دن جھام پور سے بھٹارہ تک تمام متفرق درخت جن کے نکل جانے کا اندیشہ تھا تقسیم کر دیے گئے۔ اسی دن شام کو چودھری اقبال نرائن جن کی دولت کا انحصار زمینداری پر نہیں سودی کاروبار پر تھا جمیل کے خلاف زہر اگلتے ہوئے پائے گئے۔ جھام پور میں دونّی کے حصّے دار کو پہلی بار اپنی آزادی کا احساس ہوا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ رئیس جھام پور کے پھاٹک کے قریب ایک لمبا چوڑا سور چر رہا ہے۔ آگے کبھی جھام پور میں داخل ہونے والا سور زندہ واپس نہیں ہوا۔ جمیل نے سُنا تو بظاہر نظر انداز کر دیا لیکن اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ رام سُکھ کا بیٹا دلارے گھی کی لٹیا لے کر "دوالے" آیا تو پھاٹک پر سور چرتا دیکھ کر چونک پڑا۔ سیدھا پھاٹک کے بازو میں بنی ہوئی پہریداروں کی کوٹھری میں پہنچا اور تیر کمان لے کر باہر آیا اور کان تک گھسیٹ کر تیر پیچھے پر مار دیا۔ سور نے چیخ کر ایک چکر کھایا اور ڈھیر ہو گیا۔ چودھری اقبال نرائن نے بڑا ہنگامہ مچایا سو پچاس آدمی بھی اکٹھا کر لیے لیکن رام سکھ کا سامنا کون کرتا۔ سور بھون کر کھا لیا گیا۔

آہستہ آہستہ بیکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ زمینداروں کے ڈھیروں خدمتگار، سپاہی اور کارندے مکھیاں مارنے لگے۔ کچھ کانپور اور بمبئی چلے گئے۔ کچھ محنت مزدوری پر

آمادہ ہوئے اور بہت بڑی تعداد ایسے خواب پرستوں اور کاہلوں کی بچ رہی جو پردۂ
غیب سے کچھ نمودار ہونے کا انتظار کرنے کے لیے اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کو اور توڑنے
لگے۔ ان میں کوئی ہندو اور کوئی مسلمان نہ تھا۔ ان سب کا مذہب ایک تھا، بیکاری،
بھوک روٹی۔

ان میں جو لوگ ہاتھ پیر کے سلوتر، زبان کے ٹرّے اور مزاج کے اکھّڑ تھے انھوں نے
اپنی پیاس بجھانے کے لیے اپنی سمجھ، اپنی منطق کے مطابق اپنے کنویں کھودے۔۔۔۔ اور
جرائم کی تعداد بڑھ گئی۔

غیر محسوس کن طریقے پر زندگی اپنے معمولات کو دہرانے لگی۔ دلوں میں بھڑکی ہوئی
خوف کی آگ بجھنے لگی۔ جانور کھیتوں میں پھاند کر چھوٹی موٹی فوجداریوں کی تنظیم کرنے
لگے۔ بھائی بھاوجوں کے جھگڑوں پر لاٹھیاں اٹھنے لگیں۔ دوکانداروں اور گاہکوں
میں تکرار ہونے لگی اور چار چار بچوں کی ماؤں کی محبتوں کے مقدمے پنچایتوں میں
پیش ہونے لگے۔ جمیل کا دیوان خانہ ایک بار پھر "کچہری" بن گیا اور اس کے فیصلے
اپیل سے بری ہونے لگے۔

گائے کی قربانی تو جمیل کے گھر میں کبھی ہوتی ہی نہ تھی اب اس نے دوڑ دھوپ
کر کے، سمجھا بجھا کر اور ڈرا دھمکا کر سارے بھام پور میں اس قصّے کو ختم کر دیا۔ محرّم

کے لیے جب ڈپٹی کمشنر نے بہت زور دیا اور حلقہ انسپکٹر پولیس نے بہت اصرار کیا تب اس نے حامی بھر لی۔ پھر بھی اتنی احتیاط کی کہ جام پور کا ایک تعزیہ بھی اتنا اونچا نہ تھا جو کسی درخت کی ایک پتی کو بھی چھو سکے ..... چودھری اقبال نرائن کی بچھائی ہوئی بارود پڑے پڑے سیل گئی۔

پھر جام پور کی پنچایت کا الیکشن آ گیا۔ جمیل کے مقابلے پر چودھری اقبال نرائن بڑے طنطنے سے کھڑے ہوئے۔ دو دن پہلے سے بستا پورسے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ایم ایل اے اور ایم پی آکر پڑ گئے۔ ایک ایک ہندو کے مکان پر گئے۔ جلسوں میں اقبال نرائن کا قصیدہ پڑھا اور پورے یقین کے ساتھ الکشن لڑایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، بتیس سو ووٹ پڑے جس میں اقبال نرائن کو کل دو سو ووٹ ملے، وہ بھی حاجی منشی کی دوڑ دھوپ کے بعد... چودھری اقبال نرائن کھسیانی بلّی کی طرح گھات لگا کر بیٹھ رہے۔

بدلو ڈھپالی کا لڑکا ساتواں سوم میں پڑھتا تھا کہ بدلو چل بسے۔ ماں نے سال چھ مہینے تو پڑھایا پھر ایک دن اس کا ہاتھ پکڑا اور جمیل کے نوکروں کے دستے میں شامل

کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد ماں بھی ایک کچا مکان اور دو چار برتن چھوڑ کر اپنے میاں کے پاس چلی گئی۔ منواں جمیل کی خدمت کرتا رہا اور کھا کما کر ہاتھ پیر نکالتا رہا۔ جب جمیل نے نوکروں کی چھٹنی کی تو منواں بھی نکالا گیا۔ نوکری چھوٹتے ہی اس نے اپنا کچا مکان بیچا اور بال بڑھا لیے، بیچ سے مانگ نکال کر گردن میں کیلے کا لال رومال باندھ کر مٹرگشتی شروع کر دی۔ للّو قصائی سے تو دیوار ہی ملی تھی اب اور یارانہ ہو گیا۔ اس کا اکثر وقت للّو قصائی کے بروشھے میں گانا گاتے گزرتا۔ ایک دن للّو ڈانگر بھینسا خرید کر ناوقت گھر پہنچا تو دروازے کی کنڈی اندر سے بند تھی اس نے السا کر بجائے پکارنے کے ہاتھ ڈال کر کنڈی کھولی اور اندر چلا گیا۔ نوٹنکی کی لیلیٰ کی طرح اس کی پینتیس برس کی کالی بیوی منواں کی گود میں سر رکھے شتر غمزے کر رہی تھی۔ للّو تو قصائی تھا ہی اس نے مار مار کر منواں کو بھوت بنا دیا۔ جب وہ لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا تب اس نے کوٹھری میں چھپی ہوئی بیوی کو نکالا اور بھینسے ہانکنے والا ڈنڈا اٹھایا۔ منواں اپنی مار تو جھیل لے جاتا لیکن محبوبہ کی چیخوں نے اس کے دل میں گرہ ڈال دی۔

منواں وصولیابی کے تحصیلدار کے پاس جمیل کا خط لے کر مسرکھ گیا۔ بڑی خوشامدیں کیں لیکن نوکری کی کوئی صورت نہ نکلی مایوس ہو کر وہ چلنے کو اٹھا تو ہلکی ہلکی بوندیاں پڑنے لگیں۔ ایک دھرم شالے کے سائبان میں بیٹھا وہ پانی تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ مغرب

کی اذان ہوگئی مگر بوندا باندی جاری رہی۔ پانچ چھ سال کے بوڑھے شلو کے میں بھگتے ہوئے جانے کی ہمت نہ ہوئی وہ سرکھ ہی میں اپنے ایک شناسا کے یہاں پڑ رہا۔ بیال کی توشک اور الاؤ کی گرمی کے لحاف میں کچھ سوتے اور کچھ جاگتے اس نے رات کاٹ دی۔ اور منہ اندھیرے وہاں سے گھر کے لیے چل پڑا۔ بوندیوں نے سڑک کی مٹی بٹھا دی تھی جیسے کھیت بو کر سرا دن چلا دی گئی ہو.... جیسے دھلی ہوئی مارکین پر ٹھنڈی استری کر دی گئی ہو۔ دور دور تک کوئی آدمی کوئی جانور نہیں تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک بوئے ہوئے کھیت سے دو آدمی "لاتی" لگاتے ہوئے سڑک پر آگئے اور ایک جانور کے پیروں کے واضح نشانوں کو دیکھتے ہوئے اطمینان سے چلتے رہے۔ منوال کی جبلی "کھر بد جاگ اٹھی۔ اس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ذات کے برہمن ہیں اور ان کو "دان" میں ملی ہوئی گابھن گائے کسی نے کھونٹے سے کھول لی ہے۔ اب بڑی مشکلوں سے لاتی ملی ہے۔ اب وہ اسی لاتی پر جا رہے ہیں۔ پھر جھام پور کی آبادی نظر آنے لگی۔ چرائی پر چھوٹے ہوئی جانوروں کے قدموں کے ان گنت نشانوں میں کھبی جانے والی گائے کے نشان ملتے چلے گئے۔ جب وہ نشان للّو قصائی کے چھپر میں کھو گئے تب منوال کے ذہن میں ایک منصوبہ چمک گیا۔ وہ ان لوگوں کو وہاں سے ٹال لایا اور اپنے مکان کے پچھواڑے مشورے کرتا رہا۔ بادلوں نے سورج کی تابانی کو ڈھانپ لیا تھا جیسے خیالِ میاں خوبی پر پردہ ڈالتی ہیں مگر بہرحال صبح ہو چکی تھی اور جھام پور اپنے معمولات میں مصروف تھا۔ وہ دونوں پنڈت سیدھے چودھری اقبال نرائن کے گھر پہنچے اور اپنی بپتا سنائی۔

شکار بھری ہوئی بندوق کی نال پر آگیا تھا۔ چودھری اقبال نرائن نے پل بھر میں دس بیس آوارہ آدمی جمع کیے اور للّو قصائی کے گھر کو گھیر لیا۔ پھر دروازہ توڑ کر اندر پہنچے۔ گائے کے ٹکڑے کٹے رکھے تھے۔ ایک طرف مرا ہوا لال لال بچہ پڑا تھا۔ پیلی کھال اور ٹیڑھے سینگوں کا سر دیکھتے ہی پنڈتوں نے پہچان کر دہائی مچائی۔ چودھری اقبال نرائن نے بھری ہوئی بندوق کی لبلبی دبا دی۔ زمین سے آدمی اُگنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجمع سینکڑوں کی تعداد سے گزر کر ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گیا۔ ساری بستی میں جیسے زلزلہ آگیا۔ جمیل نے خبر سنی تو الٹے سیدھے کپڑے پہن کر نکلا لیکن پھاٹک پر کھڑے ہوئے ہندو نوکروں نے اسے روک لیا اور دیوانخانے میں بٹھا دیا۔ پھر بستی بھر کی عورتوں نے بھاگ بھاگ کر اس کے گھر میں پناہ لی۔ سارا اندرونی مکان عورتوں سے سارا بیرونی مکان مردوں سے بھر گیا۔ پھاٹک بند تھا۔ اس کے ہندو نوکر اس کی کرسی کے گرد بھری ہوئی بندوقیں اور بھرا ہوا رائفل لیے کھڑے تھے جس کرسی پر وہ ایک لاش کی طرح پڑا تھا۔ پھر پھاٹک پر دستک ہوئی، سرگوشیاں ہوئیں۔ پھر کسی نے کڑک کر پھاٹک کھولنے کو کہا اور نوکروں نے رام سکھ کی آواز پہچان کر پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ وہ ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا اندر آیا اور اپنے ہاتھ سے پھاٹک کے گرانڈیل دروازے کھول دیے اور جھومتا ہوا دیوانخانے کی طرف چلا۔ دالان کی سیڑھیوں پر ہمیشہ کی طرح جوتے اتارے اور کندھے سے انگوچھا اتار کر پیروں کی گرد صاف کی اور اس طرح کمرے میں داخل ہوا جیسے نمازی مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے وجود کو سونگھ کر بھی جمیل اسی طرح لاش

کے مانند پڑا رہا۔ رام سکھ نے جھک کر سلام کیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر بڑی دیر کے بعد جمیل بولا۔

"کیا خبر ہے؟"

"دس ہجار (ہزار) آدمی کیل کانٹے سے لیس بستی گھیرے پڑا ہے اور آدمی بڑھتے چلا آئے رہا ہے"

"کیا خیال ہے"

"بھگوان بچا دیں تو بستی بچے اور بیڈھب بات یہ ہے کہ ساری عورتیں یہاں جمع ہیں..... گنڈوں لنگاڑوں کا دھاوا ان پر ہوئی"

"رام سکھ!"

"مالک"

"تم نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ تم نے مجھے گود وں کھلایا ہے لیکن میں نے تم کو گالیاں بھی دی ہیں اور مارا بھی ہے آج ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ میرا کہنا مانو اور ان تمام ہندو نوکروں کو اپنے ساتھ لے کر بھٹارہ چلے جاؤ۔ اگر کر سکو تو یہ کرو کہ مجھے تھوڑے سے کارتوس بھیج دو"

جمیل کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ رام سکھ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے جوتوں پر ہاتھ رکھے اور کانپتی آواز میں بولا۔

"ہم اور ہمرا پروار آپ کا نمک کھائیں ہے۔ آج وہ نمک ادا ہوئی..... آپ..

آپ کی ایک پھکڑی کے رد ئیں کی کھاتر (خاطر) آپ کے کھیت کی ایک بالی کی کھاتر سیکڑوں لٹھ چلے ہیں۔ سیکڑوں سر بچے ہیں۔۔۔۔۔ رام سکھ اکیلا نائیں آدا ہے۔۔ ۔۔۔ رام سکھ کے سنگ پانشو جوڈھا آئے ہیں۔۔۔۔۔ ای تماسہ دیکھے نائیں آئے ہیں۔۔۔۔۔ ای جان دے آئے ہیں۔۔۔۔ پھاٹک کے باہر رام سکھ کا پرداد مرئی اور پھاٹک کے بھیتر رام سکھ کے یار' تب کوئی آپ تک پہنچ سکت ہے۔۔۔۔ بستر کھاٹ پور ادر ہتھانے کھبر جائے چکی ہے"

یہ کہتا ہوا اٹھا اور تیر کی طرح باہر گیا۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے آدمیوں کا لشکر ساری عمارت کے گرد پھیلا دیا اور خود اوٹے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ جب "جے بجرنگ بلی" کے نعروں سے دیواریں لرزنے لگیں تب اس نے اپنے بڑے بیٹے کو للکارا کہ وہ دس بیس آدمی لے کر جائے اور حال لے کر آئے۔ بٹیا دیسی پستول میں کارتوس لگا کر اور بلّم کندھے پر رکھ کر اس سڑک پر چل دیا جو قصائیوں کے محلّے کو جاتی تھی اور جس پر ہجوم کا سب سے زیادہ دباؤ تھا۔ جمیل بیقرار ہو کر نکلا اور مسلمانوں کی بھیڑ سے' زندہ مُردوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اندر گیا۔ سارا آنگن' سارے دالان عورتوں سے بھرے تھے۔ بچوں سے بھرے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی قوتِ گویائی چھین لی گئی ہو۔۔۔۔ جیسے یہ قبروں سے نکال کر یہاں بٹھا دیے گئے ہیں۔ اب کوئی دم میں آفتاب سوا نیزے پر آجائے گا اور حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اس کے کھنکارنے کے باوجود کسی عورت نے گھونگھٹ نہیں نکالا۔ کسی نے منہ نہیں پھیرا۔ وہ اپنے ہندو نوکروں کے ساتھ کوٹھے پر

گیا۔ پھر لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ کر وہ تیسری منزل پر پہنچ گیا جس کی چہار دیواری کمر سے اونچی تھی۔ اب ساری آبادی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔ بستی کے وزیر مکمل سنّاٹا تھا۔ کوئی آدمی کوئی جانور کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا جیسے اس کے گھر کی عورتیں دسویں محرّم کا جلوس دیکھا کرتی تھیں۔ پھر وہ تیزی سے اترتا ہوا نیچے آگیا۔ رام سکھ اوٹے سے اتر کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ دس بیس آدمی اس کے داہنے بائیں چلنے لگے۔ ٹلّو قصائی کے گھر کے سامنے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ کٹی ہوئی گائے کو چماروں نے لمبے لمبے تختوں پر رکھ دیا تھا۔ چودھری اقبال نرائن کے اشارے پر مجمع نے "جے بجرنگ بلی" کے نعرے لگائے جن کی گونج سے گھڑی بھر کے لیے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ پھر قدرے خاموشی ہوتے ہی اس نے چودھری اقبال نرائن کو مخاطب کیا اور مشورہ دیا کہ کٹی ہوئی گائے معتبر چماروں کی نگرانی میں دے دی جائے اور ٹلّو قصائی کو باندھ کر تھانے بھیج دیا جائے۔ چودھری اقبال نرائن نے جو زمین سے آسمان پر پہنچ چکے تھے سُنی اَن سُنی کر دی۔ مجمع "خون کا بدلہ خون" کے نعرے لگانے لگا۔ ٹلّو قصائی اپنے مکان کی دہلیز پر تڑپ رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگ رہا تھا۔ "بھیا" کی صورت دیکھتے ہی اس نے اپنے مرتے ہوئے جسم کا سارا زور لگا کر جست لگائی اور ذبح کیے ہوئے بیل کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ جمیل کے پائجامے کی چوڑیاں اس کے خون سے نہا گئیں۔ جمیل پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"آدمی کی جان لے لی اب اور کیا لوگے اقبال نرائن؟"

وہ اتنے زور سے چیخا کہ خاموشی چھا گئی۔

"ایک دیوی کی جان کے بدلے میں ایک ہزار جانیں بھی تھوڑی ہیں بھیا جی...

...اور آپ کا نقصائی تو ابھی زندہ ہے۔"

اقبال نرائن نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

"تو کاٹ دو گلا۔"

"کاٹ بھی دیں گے تو کون مائی کا لال روک لے گا۔"

پھر جے کار کی ہاہاکار شروع ہو گئی۔

اس کے نوکر وہاں سے اس کو نکال لائے۔

مجمع بڑھتا گیا۔

لالہ سدگر سیتاپور گئے تھے۔ ان کا مسلمان مختار جھام پور کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا اور سیتاپور کو دوڑ پڑا۔

سترکھ کے بیمار بڈھا کرنے جو اس قیامت کی خبر سُنی تو ہاتھ ملنے لگے اور "بڑے بھیا" کو بلانے کے لیے چیخنے لگے۔ "بڑے بھیا" آئے اور بے نیازی سے بیٹھ کر کمزور خوشامدانہ انداز میں دیے جانے والے احکام کو سنتے رہے۔ پھر بندوقیں نکالیں گئیں۔ انتخاب کی گئیں ہاتھی نہلایا گیا پھر کسا گیا۔ پھر آدمی جمع ہوئے ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر "بڑے بھیا" سوار ہوئے۔ ایک بجے کے لگ بھگ جھام پور پہنچے۔ پورے قاصدانہ

تکلف کے ساتھ "بڑے ٹھاکر" کا پیام پہنچایا۔ جمیل نے اس سے زیادہ پُر تکلف برتاؤ کیا۔ نوکروں کو مٹھائی تقسیم کرائی۔ "بڑے بھیا" سے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ ہاتھی کے لیے بوجھ بھر گنّے لانے کا حکم دیا۔ "ٹھاکر بابا" کی خیریت پوچھی۔ ان کے مرض پر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر جب "بڑے بھیا" چلنے کے لیے اٹھے تو اس نے بغیر مخلصانہ اصرار کے ان کو رخصت کر دیا۔ حاجی منشی اور عنایت خاں دونوں اس خوف سے لرز اٹھے تھے کہ کہیں "بھیا" سترکھ چلے نہ جائیں۔ مطمئن ہو گئے۔ اس طوفان میں یہ حقیر اطمینان بھی ڈوبنے والے کے لیے تنکے کا سہارا تھا۔

مجمع برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

دو بج گئے اور اس کے باپ دادا کی بنوائی مسجد میں اذان نہ ہوئی۔ وہ باہر نکلا، سائے کی طرح ساتھ چلتے ہوتے سپاہیوں کو سیڑھیوں پر چھوڑ کر وہ مسجد میں داخل ہو گیا۔ اور زندگی میں پہلی بار اتنے لحن، اتنے سوز اور اتنے طنطنے سے اذان دی کہ حاجی منشی، عنایت اور سیکڑوں بوڑھے بوڑھے مسلمانوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ جب سنّتیں پڑھ کر اس نے سلام پھیرا تو سیڑھیوں تک صفیں قائم تھیں۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں تکبیر کہنے کے لیے کھڑا ہوا تو حاجی منشی دوسرے آدمیوں کے ساتھ اپنی صف سے نکلے کانپتے ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑے اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ جہام پور نے اتنی رقّت کے ساتھ کبھی نماز نہیں پڑھی۔

جب وہ برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نڈھال ہو کر گر پڑا تب گردیال

جوشی جس نے "بھیا" کا پتر اپنایا تھا جس نے "بھیّا" کی الپ کاٹی تھی۔ بازوؤں پر چندن اور ماتھے پر تلک لگائے، آدھی دھوتی باندھے اور آدھی دھوتی اوڑھے کھانے کی تھالی لے کر آیا۔ اس کا بڑا بیٹا پیتل کا گگرا اور پیتل کا لوٹا لیے تھے۔ وہ تھوڑی دیر سوالیہ نشان بنے کھڑے رہے۔ پھر رام سکھ نے جمیل کے آگے میز لگا دی اور دلارے سلفچی لے آیا اور یتیم مراد آبادی لوٹا اور تولیہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ بھیّا نے سر اٹھایا۔

"بھرجی کو بلاؤ۔"

کالا کالا بھرجی حاضر ہوا اور فرشی سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"چنے کی بوریاں نکال کر بھنواؤ اور گڑ کی پاریاں نکلوا کر تقسیم کراؤ۔"

گرم گرم چنوں کی سوندھی سوندھی خوشبو گڑ کے اجلے اجلے ٹکڑوں کے ساتھ اندر سے باہر تک اڑتی پھر رہی تھی کہ فسادیوں نے ہلّہ بول دیا۔ جام پور آم کے اونچے باغوں کی سبز پہاڑیوں کے اندر پیالے کی طرح آباد تھا۔ شمال مشرق سے شمال جنوب تک کھنچی ہوئی کمان کی طرح قصائیوں کے گھر آباد تھے۔ جمیل کا گھر بیچوں بیچ آبادی میں میر مجلس کی طرح کھڑا تھا۔ بھیانک نعروں اور خوفناک آوازوں کے ساتھ مجمع ریلا مار

کہ بستی کے اندر چلا۔ جمیل نے اپنی عمارت کے باہر حلقہ بنائے ہوئے سارے آدمیوں کو پھاٹک کے اندر بلا لینے کا حکم دیا اور خود تیسری منزل پر چڑھ گیا۔ یہاں سے وہاں تک قصائیوں کے مکان جل رہے تھے، پھنک رہے تھے، ذبح ہونے والی بکریوں کی طرح انسان چیخ رہے تھے اور جمیل دیکھ رہا تھا۔ وہ جمیل دیکھ رہا تھا جس کے نوکر کی صورت دیکھ کر بڑے بڑے نامی بدمعاش راستہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اب اس کے مکان کے نیچے سے گزرنے والی سڑک پر سیکڑوں برہم انسانوں کا ہجوم چلا آ رہا تھا جس کی قیادت چودھری اقبال نرائن کر رہے تھے۔ پھر رام سکھ نے اپنے کالے کمبل کو سنبھال کر اوڑھا، اپنا مریٹھا کھینچ کر باندھا پاؤں سے کمان جھکا کر چڑھائی اور تیر جوڑ کر للکارا۔

"بس چودھری جی۔۔۔۔ نیرے نہ آئیو۔"

"کیا؟"

"یہ گھر ملّو کسائی کا نائیں ہے۔۔۔۔۔۔ ای گھر کی ایک ایک اینٹ کے لیے لاٹھی چلی۔"

"تو تم روکو گے؟"

"ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ ہم روکب۔"

اس نے اپنی بوڑھی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ڈیڑھ دو سو آدمیوں کو للکار دیا۔

شکاریوں کی صورت دیکھتے ہی گیہوں کے کھیت روندتی ہوئی ہرنیوں کی ڈار

میں تہلکہ پڑ گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔

پھر خبر آئی کہ بھوکے ننگے فسادی فصلیں نوچ نوچ کر اپنے گھر بھرے لے رہے ہیں۔ آناً فاناً جمیل بھیا کے کھیتوں میں بانس گاڑ دیے گئے، بانسوں میں جھنڈے باندھ دیے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ اگر کسی نے ان کھیتوں کی ایک بالی نوچ لی تو اس کا گھر پھونک دیا جائے گا، اس کے گاؤں کا کھلیان پھونک دیا جائے گا۔ لوٹنے والے جانتے تھے کہ رام سکھ بارہ برس بعد بھی اپنا سودا چکا لے گا اس لیے جمیل بھّیا کی مینڈ پر چڑیا تک نہیں آئی اور سارے مسلمانوں کے کھیت لوٹ لیے گئے، کھود لیے گئے۔

پھر بڑے تھانیدار سکھ نندن شرما گھوڑا کداتے آئے۔ لانبی لانبی ٹارچوں کی روشنی میں انسانوں کے لہریں لیتے ہجوم کو ریوالور نکال کر دھمکایا اور تتر بتر کر دیا۔ جلتے ہوئے مکان بجھے، چیختی عورتوں، چلاتے بچّوں اور گم سم مردوں کی ڈھارس بندھی۔ پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے اور بڑے اسکول میں چہل پہل ہو گئی۔ چھام پور کے چودھری اقبال نرائن نے ملاقات کی اور دبی زبان میں اظہارِ خیال کیا کہ چھام پور میں ایک ہی آدمی ہے جس کے داہنے ہندو اور بائیں مسلمان رہتے ہیں جب تک وہ بند نہ ہوگا آگ نہ بجھے گی۔ مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھے ہوئے چوکیدار نے یہ خبر سُنی اور جمیل کے کانوں میں اگل دی۔ حاجی منشی، عنایت خاں، تفضل حسین اور بہت سے آدمی باندھے جا چکے تھے۔ جمیل نے بڑے سکون سے اپنا پائجامہ بدلا، چوڑیاں برابر کیں، بکس کھلوا کر دھراؤ شیروانی نکالی، چیسٹر کو برش کرایا، مکان

کے اندرونی کمرے مقفل کرائے اور دیوانخانے میں آکر بیٹھ گیا۔ سکھ نندن شرما آئے۔ بجھے بجھے لہجے میں گفتگو کی، پھر نظریں جھکا کر کہہ دیا کہ بڑے اسکول میں چھوٹے صاحب نے بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ جمیل فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے چسٹر پہنایا، مفلر کو گلے میں لپیٹتے ہوئے اس نے گلوگیر آواز میں رام سکھ کو مخاطب کیا۔

"میں جا رہا ہوں..... مانک پور خبر بھیج کر ضمانت کا بندوبست کر لینا.... اور دیکھو میرے اسلحے میری عدم موجودگی میں کسی کو بھی نہ دینا۔ چاہے وہ چھوٹے صاحب ہوں چاہے بڑے صاحب۔"

"مالک!"

رام سکھ منہ کھولے کھڑا رہا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جمیل میاں..... آپ نے تھانے دار دیکھے ہیں.. .... مرد نہیں دیکھے ہیں.... آپ کا ضمانت نامہ اور میرا استعفیٰ ساتھ ساتھ داخل ہو گا۔"

سکھ نندن شرما نے "چھوٹے صاحب" کو یقین دلا دیا کہ اقبال نرائن ایسے سو آدمیوں کو بند کر دیجئے تو کوئی چوں نہ کرے گا اور اگر جمیل میاں سے بد تہذیبی کی گئی تو غریب ہندو ستیہ گرہ کریں گے اور امیر ہندو ڈی آئی جی تک معاملہ لے جائیں گے۔

آخر چھوٹے صاحب قائل ہوئے۔ معقول برتاؤ کیا اور جب جمیل آنے کے لیے اٹھا
تو ایک جیپ کا ہارن بجا اور ڈی ایم آ گیا اور جمیل کے سلام کے جواب میں بولا۔
"آزادی کے تیرہ برس بعد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ کے ہوتے یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟"
جمیل نے سر جھکا لیا۔
صبح ہوتے ہوتے امن کمیٹی بن گئی۔ جمیل میاں اس کے چیرمین بنائے گئے۔
اقبال نرائن نایب چیرمین۔ گائے کے ٹکڑے، مردہ بچے کے ساتھ ایک قبر میں دفن
ہوئے، اس پر پیلا جھنڈا لہرایا گیا اور کوئی دس بجے دن میں دس بیس معززآدمیوں
کے ساتھ جمیل جھام پور میں گشت کرنے نکلا۔ آگے آگے اقبال نرائن تھے پیچھے پیچھے وہ
اور اس دن جمیل کو محسوس ہوا کہ وہ اقبال نرائن کا محکوم ہے، مفتوح ہے۔ بستی
میں جیسے طاعون چل گیا ہو، قبرستان کا سا سناٹا تھا جس کو یہ لوگ قبریں کھودنے
والے مزدوروں کی طرح توڑ رہے تھے، چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں سر جھکائے
ہوئے مردوں کے پیچھے پیچھے اپنے گھروں میں بسنے جا رہی تھیں۔ دکانیں پھوٹی آنکھوں
کی مانند کھلی تھیں۔ گاہک خوابوں کی طرح غائب ہے۔
جلے ہوئے مکانوں میں شعلوں کی گرمی باقی تھی۔ مرے ہوؤں کی قبروں کی
مٹی تازی تھی۔ زخموں سے تازہ تازہ لہو رس رہا تھا کہ اداس کی وہ رات آ گئی جس کی
صبح نیم سار میں "سہان کا میلہ" لگتا تھا جس میں شرکت کے لیے دور دور کا یاتری آتا تھا۔
اقبال نرائن نے راتی رات ہاتھ کے لکھے ہوئے پرچے تقسیم کرائے اور غدار مسلمانوں کے

ظلم کو اتنا طول دے کر مشتہر کرایا کہ خود بھام پور کے امن پسند لوگ لڑکھڑا گئے۔ گائے
کی قبر پر میلے کا بندوبست ہوا اور میلے کو ہنگامے میں تبدیل کرنے کا انتظام۔ ہر گھڑی
نئی خبر آتی تھی جو پرانی خبر کی وحشت کو بھلا دیتی تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بجائے گھر جانے کے اپنے خاندانی قبرستان گیا۔ ایک ایک
قبر پر فاتحہ پڑھا۔ ان کھیتوں کو دیکھتا ہوا جو لوٹ لیے گئے تھے اور ان کھیتوں کو دیکھتا ہوا
جن پر بانس گڑے تھے اور جن کی مینڈوں پر الاؤ روشن تھے اور مسلح آدمی پہرہ دے رہے
تھے وہ بستی آ گیا۔ یہاں کی درگاہوں میں اگر کی بتیاں سلگائیں، موم بتیاں روشن
کیں اور جب اپنے گھر آیا تو پہرہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک لانبا سیاہ سیاہ سایہ اس کے
قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"کیا یہ سب کچھ صرف ایک گائے کے لیے ہوا؟"

"اونہوں!"

اس نے بڑی گمبھیرتا سے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"پھر؟"

"یوا ہی لیے بھوا... کہ آج لگ آپ کا حکم کیسے چلت ہے... آپ کی
چھائیں ماں یہاں مسلمان بے کھٹکے کیسے رہت ہیں... یہاں تو او ہوئے جو اکھاں

نرائن کہیں..... سب اکبال نرائن کا سلام کریں... سب اکبال نرائن کے

دوارے جائیں ۔"

"ہوں... تو اقبال نرائن نے میرے خلاف دس ہزار آدمی اس لیے جمع کر لیے

کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ہے ۔"

"ای ماں کا سندیھو ہے ۔"

"اور اگر میں ہندو ہوتا اور اقبال نرائن مسلمان ہوتے... تو ۔"

"اوں ہوں.... اوئی تو ہندو ہے ہیں..... آپ ہندو ہوتے تو بھٹارہ کے

لونڈے اکبال نرائن کا بس ناس کیے دیتے ۔"

بڑی دیر تک خاموشی رہی ۔

"اڈّھا کھینچواؤ ۔"

"کا مالک ؟"

"اڈّھا کھینچواؤ..... بندوقیں نکلواؤ ۔"

جمیل نے مرحوم شیخ کے طنطنے سے حکم دیا ۔

تاروں کی چھاؤں میں اڈّھا مسلح آدمیوں کے جلوس میں روانہ ہو گیا ۔ مسرکھ جانے والی سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوئے اندھیاروں، پیڑوں کے سائے میں ڈوب گیا ۔

قصائیوں کے مکان کے سامنے سڑک کے داہنے بازو پر برگد کے چھتنار درخت کے نیچے گائے کی اُجلی قبر پر لگے ہوئے جھنڈے کا پیلا ریشمی پھریرہ لہریں لے رہا تھا۔ دور دور تک چاندنی بچھی تھی۔ لاتعداد آدمی کھڑے بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھے پنڈت گیتا کا پاٹ کر رہے تھے۔ ساری فضا تقدیس کی فضا سے بوجھل تھی۔ مسرکھ سے آنے والی سڑک پر ایک اتھاہ دھول کے بادل اڑتا نظر آیا اونچے اونچے دوڑتے بیلوں کی گردن میں پڑی ہوئی گھنگھروؤں کی ہمیلوں کی گونجیلی کھنک نے سب کو متوجہ کر لیا۔ اقبال نرائن نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ بنا کر غور سے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ رکل کے جمیل میاں کا ادھا گائے کی قبر کے پاس رک گیا۔ وہ کھدر کی دھوتی پر کھدر کا گرم کرتا اور جواہر کٹ صدری پہنے کلف دار گاندھی ٹوپی لگائے اترے۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی چوڑی پیشانی پر چندن اور تلک کی دھاریاں تھیں۔ ان کے خوبصورت گھونگھریالے بال معلوم نہیں کہاں کھو گئے تھے۔ چھلی ہوئی گدّی پر براق ٹوپی سے چوٹی کا سرا ذرا سا جھانک رہا تھا۔ قبر کے قریب پہنچ کر انھوں نے جوتے اُتارے اور قبر کو ڈنڈوت کی۔ گردیال جوشی "پرشاد" کا تھال لیے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا بوڑھے پنڈت نے پاٹ ختم کر دیا۔ اقبال نرائن نے ہکلا کر کہا۔

"جمیل میاں!"

کل کے جمیل نے اس کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

"جمیل میاں نہیں..... جھام سنگھ..... اقبال نرائن!..... جھام سنگھ!"

پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا..... اور کڑک کر بولا۔

"بولو گئو ماتا کی!"

"جے!"

اتنی زور سے تکرار ہوئی کہ جھام پور کے مکانات لرز گئے، لرزتے رہے۔

پھر کسی من چلے نے نعرہ لگایا۔

"جھام سنگھ بھیا کی جے!"

ایک بار پھر جھام پور کے درو دیوار کانپ اٹھے۔

گردیال جوشی نے پرشاد کا تھال جھام سنگھ بھیّا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ جھام سنگھ بھیّا نے پرشاد تقسیم کر دیا۔ دوسرا تھال..... تیسرا تھال..... معلوم نہیں کتنے تھال جھام سنگھ بھیّا نے تقسیم کر دیے۔

پھر جھام سنگھ بھیّا اپنی جے جے کار کے جلو میں جمیل میاں کے مکان پر آئے۔ گائے کی قبر سے نوچا ہوا جھنڈا سپاٹک کی پیشانی پر گاڑ دیا گیا۔ بوڑھے بوڑھے مسلمان آنکھیں مَل کر جھام سنگھ بھیّا کو گھور رہے تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے اقبال نرائن اپنا سر کھجا رہے تھے۔ گردیال جوشی اپنے گھر سے کھانے کی تھالی لائے۔ پھول کی تھالی میں گرم گرم کھانوں سے بھری ہوئی پھول کی کٹوریاں چنی تھیں۔ جب تک جھام سنگھ بھیّا

نے جمیل میاں کے باپ کے بنوائے ہوئے کنوئیں پر رام رام کرکے اشنان کیا تب

تک گردیال جوشی نے چبوترے کا ایک کونا گائے کے گوبر سے لیپ دیا۔ جب جھام سنگھ

بھیّا " ان پوجا " کرکے اٹھے تب بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اقبال نرائن اسی طرح بیٹھے بیٹھے

خالی نگاہوں سے خلا میں گھور رہے تھے۔

" چودھری اقبال نرائن جی ! "

چودھری اقبال نرائن جی نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ منہ کھول کر اسے دیکھا۔

" اپنی گزر بسر کے لیے بھارت ورش کے کسی دوسرے گاؤں میں ڈیرہ ڈالو ......

جھام پور میں جھام سنگھ رہے گا ...... جھام سنگھ ! "

چودھری اقبال نرائن جی نے کچھ کہنے کے لیے آنکھیں جھپکائیں اور ہونٹ کپکپائے

کہ جھام سنگھ بھیّا گرجے۔

" رام سکھ ! "

" مالک ! "

" اس مورکھ کی گردن میں ہاتھ دے کر باہر نکال دو "

رام سکھ کے سنگسی ایسے ہاتھ نے اقبال نرائن کی دُبلی گردن دبوچ لی اور وہ حاجی

منشی کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے بڈھے بیمار بکرے کی طرح خوخراتا ہوا پھاٹک کے باہر

نکل گیا۔
